ضرورت و حجیت حدیث پر لاجواب کتاب
علم حدیث
مولانا مشتاق الرحمن صدیقی کاندھلوی
کتب خانہ شان اسلام
اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا (الحشر)

ضرورت و حجیتِ حدیث پر لاجواب کتاب

مسمّٰی بہ

از

حضرت مولانا اشفاق الرحمٰن صدیقی کاندھلویؒ

خلیفہ مجاز حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

النّاشر

کُتب خانہ شانِ اسلام

اُردو بازار ○ ۱۰ راحت مارکیٹ ○ لاہور
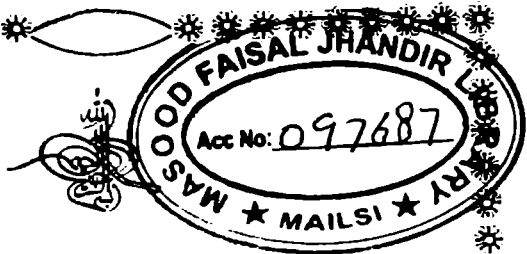
کتاب ——— علم حدیث

مؤلف ——— مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی

موضوع ——— ضرورتِ حدیث

کتابت ——— منیر احمد کاشمیری

صفحات ——— ۲۴۰

تعدادِ طباعت ——— ایک ھزار

تاریخ طباعت ——— اپریل ۱۹۷۷ء

طابع ——— منہاج الدین اصلاحی

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

آرٹ ایڈیٹر ——— محمود احمد ڈار

پیشکش ——— محمد عبد الرشید قاسمی

کتب خانہ شانِ اسلام

اردو بازار ——— لاہور

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اس کتاب کے مؤلف حضرت مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلویؒ کی شخصیت پُر بہار، سادہ، تکلف سے خالی علم وعمل کا مکمل نمونہ تھی۔ آپ نے درس وتدریس، وعظ وارشاد کے علاوہ تصنیف وتالیف کا بھی وسیع اور محققانہ کام کیا ہے۔ جن میں سے "الطیب الشذی فی شرح جامع الترمذی" کا تعارف اس مقام پر ناگزیر ہے۔ الطیب الشذی جامع ترمذی کی نہایت مبسوط اور مفصل شرح ہے جس میں فقہ اسلامی کے مسالک اربعہ پر بڑی تفصیل اور جزرسی سے کلام کیا گیا ہے اور رجال پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ عرصہ ہوا اس کا تھوڑا سا حصہ مولانا عاشق الٰہیؒ میرٹھی کے زیر اہتمام طبع ہوا تھا۔ جس پر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی نہایت عمدہ تقاریظ ہیں۔ اس عظیم الشان تصنیف کی طباعت کا ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہوسکا تھا۔ توقع ہے کہ کتب خانہ شانِ اسلام کے زیرِ اہتمام جلد ہی زیورِ طبع سے آراستہ ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز!

زیرِ نظر کتاب "علمِ حدیث" دراصل والدِ مرحوم کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو ماہنامہ "تذکرہ" کراچی میں ۱۹۵۴ء، ۱۹۵۵ء میں سلسلہ وار شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان مضامین میں فنِ حدیث، تدوینِ حدیث، تاریخِ حدیث اور رُجالِ حدیث کے موضوعات پر نہایت شگفتہ انداز اور موجز اسلوب میں گفتگو کی گئی ہے۔ حدیث کے موضوع پر مطالعہ کرنے والے اہلِ علم اور طلبہ کیلئے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ صدیقِ مکرم مولانا عبدالرشید صاحب قاسمی مالک کتب خانہ شانِ اسلام اردو بازار لاہور نے اس کی طباعت کا ارادہ ظاہر فرمایا تو میں نے ان مضامین کو یکجا کر کے کتابی صورت میں مرتب کر دیا۔ مولانا عبدالرشید صاحب قاسمی بڑے فاضل اور علم دوست انسان ہیں راقم الحروف سے انہیں خصوصی تعلق ہے، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور ان کے علمی کاموں میں برکت عطا فرمائے!

وما ذالک علی اللہ بعزیز ✶——✶ ساجد الرحمٰن صدیقی

علمِ حدیث

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

عرصہ سے بالخصوص جب سے آزادی کی سمیٰ ہوا چلی ہے، انکارِ حدیث کا شور برپا ہے۔ احکام کی پابندی اور بجا آوری سے بچنے کے لیے دین کی ایسی تعبیر کی جارہی ہے جو جملہ قیود سے آزاد ہو۔ ہوائے نفس کے باعث اگر ہم دین کا ساتھ نہ دے سکیں اور اخلاق و اوصافِ دین سے اپنے کو آراستہ اور تمیز نہ کر سکیں تو چاہتے ہیں کہ دین ہی کو بدل ڈالیں [1]

"دین کی پابندی" اُس کی حدود و قیود" اور گرفت سے آزاد ہونے کی اس سے بڑھ کر کیا صورت ہو سکتی ہے کہ خود ترجمانِ وحی اور معلمِ وحی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم ہی کو یکسر دین سے خارج کر دیا جائے (سلفِ صالحین اور ائمہ مجتہدین تو کسی شمار ہی میں نہیں)۔

اور آپؐ کے اقوال و افعال اور احوال کو دین کی شرح ماننے سے انکار کر دیا جائے تاکہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق دین کی من مانی شرح کی جا سکے۔ اور اس من مانی شرح کی نسبت اعتقادِ جازم اور پختہ یقین ہو کہ یہ واقعی اسلام اور حقیقی ایمان ہے اور اس

---

[1] نعوذ باللہ من ذالک۔ (قاسمی)

کے علاوہ جو کچھ ہے وہ مُلّائی اسلام ہے۔

اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زرّین تعلیم سند نہیں، آپ کے حکمت بھرے اقوال اور جوامع کلم حجّت نہیں، آپ کے بلند اعمال، آپ کے پاکیزہ احوال قابلِ اقتدا و اتّباع نہیں تو اپنی نارسا عقل کے سوا قرآن فہمی کا اور کونسا ذریعہ رہ جاتا ہے۔ دینِ متین کے لیے نبوی شرح و تعبیر آپ کے لیے حجّت نہیں، تو پھر آپ بالکل آزاد ہیں، دین کے نام سے جو چاہیں لکھیں اور جس امر کی چاہیں دعوت دیں۔

حضور صلعم کی حیاتِ طیّبہ نمونہ نہیں، صحابہؓ کی زندگی دین کی شرح اور سنتِ نبوی کی مظہر نہیں، ائمۂ اسلام اور خیر القرون کی جانفشانی اور اجتہادات کا مجموعہ بے سود اور جاہ طلبی اور خوشنودیٔ سلاطین و امراء کا ذریعہ قربت ہو تو یہ ہے اصلی اسلام اور دینِ واقعی ؎

"قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا"

حقیقت یہ ہے کہ حدیث کی تشریعی حیثیت کا انکار، حقیقتِ نبوّت سے ناآشنائی اور لوازمِ نبوت اور اوصافِ نبوّت سے انکار ہے۔ کیونکہ جب نبیؐ کے اقوال و اعمال و احوال حجّت نہیں تو پیغمبرؐ کی حیثیت صرف قاصد یا "پوسٹ مین" کی رہ جاتی ہے کہ اس کا کام صرف زبانی یا تحریری پیغام پہنچانا ہے اور یہ خدمت انجام دینے کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا ہے اور اس کو پیغام رسانی کے بعد اور کچھ کہنے سننے کا حق نہیں رہتا۔ اگر انکی یہ مُراد ہے اور نفس الامر یہی ہے تو بے شک حدیث و سُنّت کوئی چیز نہیں رہتی لیکن پھر نبی کا وجود اور عدمِ وجود برابر ہے اور اس صورت میں اس کے علاوہ کہ حقیقتِ نبوّت اور غرض و غایت اور اوصاف و لوازمِ نبوّت کا انکار

ہے۔ نبی اور غیر نبی میں بھی کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ حالاں کہ نبی اور غیر نبی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا و ہادی و رہنما فرمایا ہے یعنی نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں۔ پس اقوامِ عالم میں وہ مبعوث ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ بنی نوع انسان کو اندھیرے سے اُجالے میں لانے کے لیے دو شمعیں روشن کی جاتی ہیں۔ ایک اللہ کی کتاب، دوسری اللہ کے رسولؐ کی سُنّت۔ ان دونوں کی روشنی اور نور کا امتزاج ظلمت و ضلالت کی تاریکیوں کو فلاح و صلاح کی روشنی اور نور سے بدلتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ یعنی تم کو کفر کرنا کیونکر زیب دیتا ہے حالانکہ تم کو اللہ کی آیتیں سُنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کے رسول موجود ہیں۔

پس اِس آیت سے معلوم ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس تھیں۔ ایک آیاتِ الٰہی جو اُن کو سُنائی جاتی تھیں اور دوسرے خود رسولؐ کا مستقل وجود، جو اپنی تعلیم و تلقین، فیضِ صحبت اور اثر سے اُن کو بھٹکنے نہ دے گا اور ضلالت سے مانع آئے گا۔

اگر صرف کتابِ الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی تو رسولؐ کے ذکر کی حاجت نہ تھی بلکہ خود بعثت ہی کی کیا ضرورت تھی۔ اِس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب صامت (قرآن) اس کی کتاب ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے۔ جس طرح آنکھ کی

بینائی بلا خارجی روشنی، آفتاب و ماہتاب اور بجلی وغیرہ کے بصارت کا کام نہیں کر سکتی، بالکل اسی طرح بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ پر قرآن کی ہدایات بغیر ہادی نہ سود مند ہیں، نہ وہ دینِ محمدی ہے۔

نبوت کا آئینہ صدق وصفا کا آئینہ ہوتا ہے۔ نبی کا مجسم پیکر ظلمت کدۂ عالم کا چراغ اور علم و ہدایت کا مطلع النور ہوتا ہے۔ جس طرح اس کا صحیفہ اور وحی ربانی نور ہوتا ہے، وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے۔ جس سے اندھے دیکھتے، گمراہ راہ پاتے اور حق کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں۔ وَ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ۔ یعنی اور اللہ کے حکم سے اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے والا اور ایک روشن گر آفتاب بنا کر بھیجا ہے۔"

ایک نبی یا پیغمبر محض قاصد اور (نعوذ باللہ) ڈاکیا یا پوسٹ مین ہرگز ہرگز نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ عملی زندگی میں صحیفۂ ربانی کا اتم و اکمل نمونہ ہوتا ہے۔ دنیا میں ہر جنس اور ہر نوع کی کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوتی ہیں جن کی بنا پر وہ دوسروں سے ممتاز ہوتی ہے وہ خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جن سے اس جنس یا نوع کی کوئی ذات خالی نہیں ہوتی۔ اسی طرح نبوت کی بھی کچھ خصوصیات ہیں جو نبوت کے لیے بمنزلہ لوازم حقیقت کے ہیں۔ چنانچہ دنیا میں بہت سے پیغمبر دنیا کی مختلف قوموں اور مختلف زمانوں اور احوال میں مبعوث ہوئے، وہ ان خصوصیات سے ہمیشہ ممتاز ہوئے ہیں۔ مثلاً خدا نے کسی نہ کسی طرح اپنے کلام و ارشاد سے مفتخر اور اپنے احکام سے مطلع فرمایا ہے۔

اُن کے ادراک و احساس کی قوتوں کو اس قدر بلند فرمایا کہ عام انسانوں کو جو چیزیں محسوس ہی نہیں ہوتیں، اُن کو محسوس ہوتی اور نظر آتی ہیں۔ عامۃ الناس جن آوازوں کو نہیں سُن سکتے وہ اُن کو سنائی دیتی ہیں۔ ملائکۂ الٰہی خدا کے قاصد بن کر اُن کے پاس آتے ہیں۔

صداقت کے لحاظ سے ان کے خواب اور بیداری کا یکساں عالم رہا ہے کیونکہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں، لیکن دل نہیں سوتے۔

حقیقتِ نبوّت

امام غزالیؒ نے "معارج القدس" میں اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھا ہے:

"نبوّت، انسانیّت کے رتبہ سے بالاتر ہے، جس طرح انسانیّت حیوانیّت سے بالاتر ہے۔ وہ عطیۂ الٰہی اور موہبتِ ربّانی ہے۔ سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی۔"

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح انسان کو عقل کے باعث حیوان پر فضیلت ہے کہ یہ عقل اور دماغی خصوصیّت حیوان میں نہیں پائی جاتی اور اسی کے بل پر انسان حیوان پر حکمرانی کرتا ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السّلام کو اپنے نفوسِ قدسیہ کی بناء پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے وہ اپنے قدسی نفوس اور پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہِ راست دکھاتے اور خود راہِ راست پر قائم رہتے ہیں۔ ان کی پیغمبرانہ عقل و فہم، انسانی عقول سے بالاتر ہوتی ہے جس کی بناء پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدابیر کا فرض انجام دیتے اور ساری نوعِ انسانی کے مسائلِ حیات اور جملہ کار و بار کو حل کرنے اور انجام دینے کے لیے "وحیِ الٰہی" کی روشنی میں نقشے بناتے ہیں۔ اور جس طرح انسانوں کے عجیب و غریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں، اسی طرح پیغمبروں کے عجیب و غریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں۔ اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریّت اور انسانیّت میں

شریک ہوتا ہے، مگر عقلیت و معنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ ان میں وحی قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی وہ دوسروں میں نہیں ہوتی اس لیے ہر رسول کی اطاعت ضروری اور لازمی ہوتی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ط "یعنی ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، مگر اس لیے کہ اُس کی اطاعت کی جائے"۔

حتیٰ کہ ایک مقام پر رسول کی اطاعت کو خدا کی اطاعت فرمایا اور خدا کی اطاعت اس کے احکام کی بجاآوری میں ہے۔ پس رسولؐ کی اطاعت احکامِ رسولؐ کی بجاآوری میں ہوئی۔ بلکہ احکامِ رسولؐ کی اطاعت میں عینِ خُدا کی اطاعت ہے چنانچہ قرآنِ حکیم ہمیں بتاتا ہے مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ[1] دوسرے مقام پر ارشاد ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ط اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو، تو میری اطاعت کرو۔ خدا تمہیں محبوب رکھے گا۔ کسی مقام پر یہ مضمون نہیں کہ :

وَمَآ اَنْزَلْنَا مِنْ كِتَابٍ اِلَّا لِیَعْمَلَ النَّاسُ بِهٖ ط ہم نے کوئی کتاب نہیں اتاری مگر اس لیے کہ لوگ اس پر عمل کریں۔

غرض و غایتِ نبوّت

عالمِ کائنات کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و کردار کی اصلاح و تربیت کی جائے۔ اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و

---

[1] جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے گویا خدا کی اطاعت کی۔ ۱۲

تذکیر ہے۔ اس سے زیادہ متمدّن طریقہ یہ ہے کہ اخلاقی اصول و مبادی پر عُمدہ طرز و انشاء کے ساتھ کتابیں لکھ کر تمام عالم میں پھیلائی جائیں اور لوگوں کو اُن کی تعلیم دلائی جائے۔

ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بجبر محاسنِ اخلاق کی تعمیل کرائی جائے۔ یہی طریقے ہیں جو ابتداء سے لے کر آج تک دنیا میں رائج ہیں اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دَور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ صحیح اور سب سے بہتر عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے نہ تحریری نقوش پیش کیے جائیں، نہ جبر و اکراہ سے کام لیا جائے، بلکہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم سامنے آجائے، جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو۔ جس کی ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ امرِ سلطانی بن جائے۔ دُنیا میں آج جو اخلاق کا سرمایہ ہے، سب انہی نفوسِ قدسیہ کا پرتَو ہے۔ اِسی بناء پر ہر ہر قدم پر نئے نئے رہنماؤں کی ضرورت پیش آئی۔ اور اسی لیے عام انسان اپنی تکمیل کے لیے ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا جو صاحبِ شمشیرِ رنگین بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، بادشاہِ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرماں روائے جہاں بھی ہو اور سُخرہ گرداں بھی، مفلسِ قانع بھی ہو اور غنیِ دریا دل بھی۔ یہ برزخِ کامل، یہ ہستیِ جامع، یہ صحیفۂ یزدانی عالمِ کون کی آخری معراج ہے، اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ صحیح حدیث میں ہے کہ میری اور انبیاءؑ کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی نے نہایت خوبصورت اور کامل مکان بنایا ہو۔ لیکن قدرے قلیل حصہ باقی رہ گیا ہو۔ جو شخص مکان کو دیکھتا ہے بہت پسند کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر یہ حصہ بھی پورا ہو جاتا تو بہتر ہوتا، اور میں وہ آخری

حصہ ہوں۔

عالمِ فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں۔ اس لیے یہ ہستیِ جامع بھی دنیا میں ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔ اِس لیے ضروری تھا کہ اس کی زبان کا ایک ایک حرف، اس کی حرکات و سکنات کی ایک ایک اُدا اور اس کے حلیہ و وجود کے ایک ایک خط وخال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحلِ زندگی میں جہاں ضرورت پیش آئے رہنمائی کا کام دے سکے۔

لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ دنیا میں وہ کونسا شخص گزرا ہے جس کا کارنامۂ زندگی اس طرح قلم بند ہوا ہو کہ ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام ہو کہ کسی صحیفۂ آسمانی کو میسر نہ آسکا۔ اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہو کہ اقوال وافعال وضع وقطع، شکل وشباہت، رفتار وگفتار، مذاقِ طبیعت، اندازِ گفتگو، طرزِ زندگی، طریقِ معاشرت، کھانے پینے، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک اُدا محفوظ ہو گئی ؟ تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک ہی صدا بلند ہو سکتی ہے، محمدؐ عربی فدیناہ بآبائنا واُمہاتنا۔

پس حضورؐ کے ارشادات کا انکار اور حدیث کو تشریعی حیثیت سے ہٹا کر محض تاریخی حیثیت دینا اور حضورؐ کو محض "مبلّغِ قرآن" ماننا دراصل دین کی تکمیل کا انکار ہے، اور نبوّت ورسالت کی ناشناسی، حقیقت میں نبوّت کے لوازم وغایت کی ناواقفیت پر مبنی ہے۔ نبی قاصدِ محض نہیں ہوتا۔

غلط فہمی کا ازالہ

قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس مضمون کی ہیں کہ رسولؐ کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ عام انسان اور نبیؐ میں فرق صرف وحی ورسالت کا ہے۔ اس سے آجکل بعض کوتاہ بینوں

کو یہ دھوکا ہو گیا ہے کہ رسولؐ کا فرض صرف وحیِ الٰہی کی تبلیغ ہے۔ یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانوں تک بعینہٖ پہنچا دینا اس کا کام ہے۔ اس کے معنٰی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے اور نہ استحقاق۔

اُن کے نزدیک تبلیغِ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بَر کی ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے مگر اُس خط کے مفہوم و معنٰی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے۔

شاید یہ دھوکہ اِن آیات کے علاوہ لفظِ رسول سے بھی ہُوا ہے جس کے لفظی معنٰی پیغامبر اور قاصد کے ہیں۔ لیکن یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں ان کو رسول کہا گیا ہے "نبی خبر پانے والا" بھی تو کہا گیا۔ "مبشر" خوشخبری سُنانے والا۔ "نذیر" ڈرانیوالا "سراجِ منیر" روشن چراغ، صاحبِ حکمت، صاحبِ خلقِ عظیم، صاحبِ مقامِ محمود، مجتبیٰ، مقبول، مصطفےٰ، برگزیدہ، مبیّن بیان و شرح کرنے والا، معلّم سکھانیوالا، مزکّی، پاک و صاف کرنے والا۔ داعیِ الی اللہ، اللہ کے دین کی طرف بُلانے والا، حاکم فیصلہ کرنے والا، مُطاع واجب الاطاعت، آمر حکم کرنے والا، ناہی روکنے والا بھی تو کہا گیا ہے۔

کیا یہ اوصاف و القاب صرف اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والے قاصد ہیں؟ جن کو اصل پیغام کے مفہوم و معنٰی سے ایک مجرّد قاصد اور نامہ بَر کی طرح کوئی سروکار نہیں، حالانکہ قرآن کے مفہوم و معنٰی کی تشریح و تفسیر کا تو آج ہر عربی دان کو، بلکہ اس سے بھی ادنیٰ کو حق حاصل ہے اور اس کی رد و کد حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مُدّعی دعوٰی کرتا ہے مگر خود صاحبِ پیغام کو اپنی

پیغمبری کے وقت نہ مفہوم و معنیٰ کا علم تھا اور نہ ہی اس کی تشریح کا حق تھا:
اِنَّ هٰذَا الشَّیْءُ عُجَابٌ ۔

اِس اشتباہ اور غلط فہمی کی ایک اور وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام میں شرح اور وضعِ قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کرایا گیا ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ط کیونکہ وہی اصل شارع ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ط ..... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ط ..... هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ط
یعنی جو لوگ خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں ..... وہ ظالم ہیں ..... وہ فاسق ہیں۔

اب اگر رسول کیلئے وحی کتاب سے الگ شرح تصنیف کرنے کا حق تسلیم کیا جائے، تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا۔ لیکن اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسول اللہ صلعم کو "شارع" نہیں، بلکہ "شارح" قرار دیتے ہیں۔
غور فرمایئے! عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے اور لوگوں پر استعمال کرتا ہے تو کیا وہ اپنے اس عمل سے سلطانِ وقت بن کر اپنی صوابدید کے مطابق قانون وضع کرنے کا منصب حاصل کرتا ہے، یا قانون کا محقق اور شارح ہوتا ہے؟

یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے جس کو ہم دین کی اصطلاح میں نبیؑ، رسولؑ، معلمؑ اور پیغمبر کہتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے اکثر جگہوں پر اس کی وضاحت کی ہے، مثلاً اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَیَّ ط یعنی "میں تو (فرائضِ رسالت کی انجام دہی میں) صرف اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے اور

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۔ یعنی (اللہ تعالےٰ خود اس بات کی شہادت دیتا ہے) اور نہ وہ خواہشاتِ نفس کے تحت بولتا ہے"۔ وغیرہ۔

دوسرا اور حقیقی جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیغام، مقصد، مفہوم اور فیصلہ سے، صرف وحی کے اسی طریقۂ خاص کے ذریعے اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا جس طریقِ خاص سے قرآن نازل ہوا ہے، بلکہ وہ اقسامِ وحی میں سے کسی قسم کے ذریعے اپنی مشیت رسولؐ پر واضح کرتا ہے اور ان میں سے ہر نوعِ ہدایت کی تعمیل تمام اُمت پر فرض ہے۔ یعنی خواہ وہ وحی ہو جو الفاظِ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہے جس کو قرآن کہتے ہیں یا ربانی مفہوم و معنیٰ رسولؐ کے الفاظ میں ادا ہوں، جس کو حدیث و سُنّت کہتے ہیں۔

اس جواب کا منشاء یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک وحیِ حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالےٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرماتا رہا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتاب اللہ، صحیفۂ ربانی اور قرآنِ مبین کا نام دیا گیا ہے۔

دوسرا علم پہلے علم کی غیر متبدل کلی اصول کے تحت اُس کے مقصد کی صحیح تشریح اور اُس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر اہم اور متبدل اُمور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتلاتا ہے اور اسی دوسری قسم کا علم ہے جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے اور جس کو اہلِ اصول اپنی اصطلاح میں سُنّت کہتے ہیں۔

کتاب میں اصولی احکام ہیں اور سُنّت اُن اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان

ہے"۔ کتاب براہِ راست وحیِ الٰہی کا نتیجہ ہے اور سنّت فراستِ رسولؐ اور فہمِ نبوی کا۔ کتاب باللفظ وحی ہے اور سنّت بالمعنیٰ۔

علماءِ اصول نے کتاب اور سنّت دونوں کو وحی مانا ہے۔ اور دونوں کے درمیان فرق یہ کیا ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنّت اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ اِس تشریح کا مقصود حقیقتاً تلاوت اور عدمِ تلاوت کا فرق نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنیٰ کے ساتھ الفاظ بھی وحی کیے گئے ہیں۔ اس کا حرف حرف اور نقطہ نقطہ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کی پیشین گوئی میں داخل ہے اور اسی لیے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ محال ہے اور سنّت میں الفاظ کی نہیں صرف معانی کی حفاظت ہے۔ اِسی لیے کتاب اللہ کی وحی مدوّن، مکتوب اور محفوظ کی گئی اور نماز میں اس کی قرأت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور سے اُسکی تلاوت مسنون اور اجرِ عظیم کی موجب ہے۔

اور سنّت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں۔ اس لیے اس کی لفظی حفاظت کو اس درجہ اہمیت نہیں دی گئی اور نہ نماز میں اس کے الفاظ قرأت کیے جاسکتے ہیں اور نہ اُن کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اور نہ ان کو کتابِ الٰہی کہا جاسکتا ہے مگر معنوی و اصولی لحاظ سے ان کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کرلی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسولؐ اور اس کے پیروؤں اور پھر ان کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے ———————————————

——— یہاں تک کہ آج بھی تمام امّت کے عملدرآمد سے عملِ تواتر کی صورت میں محفوظ ہے اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کرکے الفاظ اور کتبِ احادیث

کے اوراق میں اُن کو محفوظ کر دیا ہے۔

الحاصل قرآنِ پاک کے تیرہ مقامات پر مختلف آیتوں میں یہ مضمون ہے اِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِیْنُ ۝ "ہمارے رسولؐ پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے"۔ اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے، مبیّن و شارح نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس کا پیغام اُتار دینا نہیں اور بزور لوگوں کو مسلمان بنا دینا اور بالجبر منوا لینا نہیں اور نہ پیغام پہنچانے کے بعد تمہارے کفر و انکار و عدمِ ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے۔ قرآنِ پاک میں جہاں اس معنیٰ کی آیات آئی ہیں، ان کا منشا صرف یہی ہے۔ سورۂ انعام میں ہے وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ج وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝ (تم کو ہم نے اُن پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر داروغہ ہو) اور لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (تم ان لوگوں پر داروغہ نہیں ہو)

یہ مطلب اس کا ہرگز نہیں کہ وحیِ کتاب قرآن کے بلاغ اور تبلیغ کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ تعلیم کتاب و حکمت کا حق ہے اور نہ رسولؐ کے اقوال و افعال اور احوال کی بحیثیتِ رسول اطاعت ضروری ہے۔ یہ کہنا اور یہ معنیٰ باور کرنا صدہا آیات کا انکار ہے اور نیز نبوّت و خصائصِ نبوّت کا انکار ہے۔

قابلِ حیرت اور لائقِ تعجب ہے کہ اس جہالت و حماقت اور اس کفر و ضلالت کو حقیقی اسلام اور واقعی اسلام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور نفس الامری اسلام اور کافۃ للناس کے اسلام کو، خیر القرون کے اسلام کو، محدثین اور سلف صالحین کے اسلام کو "ملائی اسلام" سے نامزد کیا جاتا ہے۔

تین مقامات پر تو یہ مضمون کہ رسولؐ پر صرف پیغام پہنچانا ہے اَطِیعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیعُوا الرَّسُوْلَ کے بعد ہے (سورۃ مائدہ، سورۃ نور، سورۃ تغابن)

جس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی اطاعت و پیروی امت پر واجب ہے۔

اس کے بعد یہ مضمون ہے کہ رسول اللہ صلعم کے ذمہ صرف پیغام پہنچا دینا ہے جس کے صاف معنی یہی ہیں کہ بہ جبر منوانا نہیں۔ قرآن نے صاف کہہ دیا ہے وَاِنْ تُطِیْعُوْہُ تَہْتَدُوْا وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِیْنُ۔ اگر رسولؐ کی اطاعت کرو گے تو کامیاب ہو گے اور رسولؐ پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ پاک کی تیرہ ۱۳ آیتوں میں جو یہ مضمون ہے کہ رسولؐ کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ اِس کا یہ مفہوم نہیں کہ رسولؐ کا رسالت اور پیغام پہنچانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ اُس کی اطاعت واجب نہ اس کی اقتدا ضروری ہے اور نہ اس کی حیثیت ایک قاصد کے علاوہ ہے۔ بلکہ اس کے برعکس نبی کے اقوال و افعال کا اتباع عین قرآن کا اتباع ہے، اس لیے کہ وہ خود قرآن کی مختلف آیات میں مامور بھی ہے اور احکامِ کلیہ قرآن کی ایک فرد اور ایک جزئی ہے۔

بشریتِ رسولؐ

اسی طرح بعض آیتوں میں جو یہ مضمون ہے کہ میں صرف بشر اور رسول ہوں، یا یہ مضمون ہے کہ میں تم جیسا بشر ہوں، فرق یہ ہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا اور اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ۔

جو شخص بشریت کی مذکورہ آیات اور دیگر آیات پر نظر ڈالے گا وہ بلا ادنیٰ تامل

سمجھ لے گا کہ اِن آیتوں میں جس قسم کی مماثلت اور بشریت کا ذکر ہے۔ اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور اعضاء وجوارح وقویٰ اور ہیئتِ بدنی سے ہے، ورنہ اخلاقی روحانی، دماغی وقلبی، علمی اور عملی حیثیت سے وہ انسان ہوتے ہوئے بھی غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے۔ نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امر فارق ہونے کے یہ معنیٰ نہیں کہ نبی اِلقاءِ ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ تمام اوصاف وکمالات اور جملہ صلاحیتوں میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے۔ یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے اگر کوئی کہے کہ عالم وجاہل میں صرف علم کا فرق ہے ورنہ فکری اور ذہنی صلاحیتوں میں یہ دونوں یکساں ہیں، حالانکہ علم کی صفت سے کسی کا متصف ہونا خود اس بات کو مُستلزم ہے کہ وہ جاہل کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے، اخلاق ودانش میں، تہذیب وشائستگی میں، سلیقہ ودانائی میں، حکمت واصابت میں اور امانت ودیانت میں ممتاز ہو۔

وحی ورسالت کو چھوڑ دو، دوسرے انسانی کمالات کو لے لو، تو بھی یہ ماننا پڑیگا انسان کے جتنے اوصاف وکمالات ممکن ہیں اُن سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانبِ کمال تک پہنچنا ممکن ہے اور جو وہاں تک پہنچ جائے وہ اپنے جسمانی اوصاف وخصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قویٰ میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا نمونہ "رستم" کیا انسان نہ تھا۔ اور علم وفضل میں معروف یونانی فلسفی "ارسطو" کیا اپنی حیثیت میں فوق البشر تھا۔ اور موجودہ دُنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادوں کے حاملین کیا بشریت سے پاک ہیں؟

ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہمارے ان سوالات کا جواب ہر سلیم الطبع انسان تقریباً انہی الفاظ میں دے گا کہ یہ سب مشاہیر اپنے جسم وجان کے اعتبار سے بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ اور شعبہ میں عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز تر رہے ہیں۔ نیز اللہ کی سنّتِ جاریہ اُن پر جاری رہی ہے اور اپنی احتیاجات و خواہشات کی تکمیل کے لیے عام انسانوں کی طرح مجبور تھے۔ گرسنگی و تشنگی اور برودت و حرارت وغیرہ ان کے احساسات پر اسی طرح اثر انداز ہوتی تھیں، جس طرح ایک عام انسان پر۔

متذکرہ تمثیلات کو نگاہ میں رکھ کر ہم ایک "نبی انسان" اور "غیر نبی انسان" کو سمجھنے میں کسی نہ کسی حد تک مدد لے سکتے ہیں۔ وہ غیرِ نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص ولوازم میں عام انسانوں سے صریحاً الگ، بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی اُن سے ممتاز ہیں۔

پس نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر، وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی، وحی کے سینکڑوں لوازم خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑیگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نبی کا کام صرف رسالتِ محضہ ہو اور نبی کے حکم کی اطاعت اہم ہونے کے باعث ہو، اور نعوذ باللہ نبی کی حیثیت پوسٹ مین جیسی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ اپنی رُوحانیت

اور بے گناہی، پاکدامنی اور اختصاصِ نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں۔ انبیاءؑ انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود ہی اور اس کے خصائص اور لوازم میں اُن سے صریحاً الگ بلند اور اعلیٰ، بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی اُن سے ممتاز ہیں۔ آنحضرت صلعم کو صومِ وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہؓ بھی آپؐ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا متّصل روزہ رکھتے ہیں تو آپؐ اُن کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں اَیُّکُمْ مِثْلِی اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ (بخاری) "تم میں کون میرے مثل ہے، میں رات گزارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے"۔ کیا عام انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور روحانی سیرابی میسر آتی ہے؟

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا، صحیح حدیثوں سے ثابت ہے، آپؐ نے فرمایا: "میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا"۔ وَکَذٰلِکَ الْاَنْبِیَاءُ تَنَامُ اَعْیُنُھُمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوْبُھُمْ (بخاری) اور اسی طرح انبیاءؑ کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے۔ کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی ہے؟ قرآنِ پاک میں ہے اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو؟ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ اور اس نے فرشتہ کو آسمان کے کناروں میں دیکھا۔ کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں؟

آنحضرت صلعم کے انتساب سے امّہاتُ المومنین کو جو شرف حاصل ہوا اس کا اقتضاء یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے امّہات المومنین کو خطاب کر کے فرمایا لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ "اے پیغمبرؐ کی ازواج تم ایسی نہیں ہو، جیسی ہر عورت، تم پیغمبرؐ کی بیویاں عام عورتوں کی مثل نہیں"۔

تو پیغمبر تو بدرجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ کَاَحَدٍ مِّنَ الرِّجَالِ نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بدرجہا بلند تر اور ممتاز ہو۔

ایک فرقہ کا جو خیال ہے اور اس کی بڑے زور سے اشاعت ہو رہی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحیِ قرآنی کی صورت میں آیا۔ اس کے علاوہ آپؐ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں، وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں، جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے نہ اسلام کا جزو ہے۔ صرف قرآنی وحی کا نام اسلام رکھا ہے اور تیرہ سو صدی کے مروجہ کا نام "ملائی اسلام" رکھا ہے۔

یہ خیال سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ قرآن میں انبیاءؑ کے لیے بشریت کا اثبات اوصافِ خداوندی کے مقابلہ اور رسالت و بشریت میں منافات دفع کرنے کے لیے ہے۔ یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ صرف وحیِ الٰہی پہنچانے کے علاوہ رسول کو اور کوئی امتیاز نہیں۔ اس خیال کے باعث بیسیوں آیتوں کی تحریف و انکار کرنا پڑے گا۔ اور آج تک تیرہ سو صدی میں جس قدر مسلمان گزرے، سب کی تجہیل اور تفسیق کرنی پڑے گی اور سب کی تجہیل پر تیار ہونا، اپنی جہالت پر دلیل لانا اور اپنی عقل و فہم کے نوحہ و ماتم کے مترادف ہے۔

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں نبوت و رسالت کے تمام لوازم و خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق و امتیاز ہے۔ کسی انسان کو صاحبِ وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا حامل بھی ضرور ماننا پڑے گا۔ انتہیٰ[1]

---

[1] اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْہُ (قاسمی)

اِذَا ثَبَتَ ثَبَتَ بِلَوَازِمِہٖ۔

انبیائؑ اور ان کے مماثل و مشابہ اشخاص

انبیائؑ اور ان کے مشابہ اشخاص میں چار حیثیتوں سے فرق نمایاں ہوتا ہے۔ مبدءٔ اور منبع کا فرق، غرض وغایت کا فرق، دعوت کا فرق، علم وعمل کا فرق۔ نبی کے علم کا مبدءِ ومنبع، ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیمِ ربانی، شرحِ صدر اور وحی والہام ہوتا ہے۔ اور حکیم کے علم کا ماخذ ومنبع تعلیم انسانی، گزشتہ تجربہ، استقرار وقیاس ہوتا ہے۔ یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالقِ عقل سے۔ اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال وافعال اور جدّ وجُہد کا منشار اپنی شہرت طلبی علم کا اظہار اور قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے۔ مگر ایک نبی کا مقصد خُدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضا کے لیے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے۔ دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت، کو تمامتر حکمتوں، مصلحتوں اور علت و اسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے۔ مگر نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے۔ حکیم کہتا ہے لیکن کرنا اس کے لیے ضروری نہیں۔ نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اُس کے لیے ضروری ہے۔ وہ صرف جلوت کے منبر پر آراستہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ جلوت وخلوت اور ظاہر و باطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔

دنیا میں سقراط، بقراط، افلاطون وغیرہ ایک طرف، اور ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ و محمد علیہم السلام دوسری طرف ہیں اور دونوں کی سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرّہ بھر بھی

التباس نہیں۔

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج ولشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں تاکہ فتنہ وفساد رک جائے۔ فلاسفر اپنے دعووں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کی بات لوگ تسلیم کریں، لیکن پیغمبرؑ اپنے پیروؤں کے قلوب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ از خود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کرلیں۔ وہ اگر کبھی قانون وحد وسزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے اوّلین نہیں۔ بلکہ اُن کی اوّلین غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیروؤں کو خُدا کا اور اس کے حاضر وناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہوجائے کہ وہ اس کے حکموں اور نصیحتوں کو جو ان کے ذریعہ سے آتی ہیں بے چوں وچرا تسلیم کرلیں۔ اس تحریر سے اندازہ ہوگیا کہ ہر شیریں نوا واعظ، ہر مؤثر البیان خطیب، ہر دقیقہ رس مقنن، ہر کشور کشا فاتح اور نکتہ داں حکیم اس لائق نہیں کہ نبوّت ورسالت کا اہم اور بلند اور مقدّس منصب اس سے منسوب کیا جائے۔ اس منصب کے ساتھ کچھ ایسی شرائط، لوازم اور خصوصیات وابستہ ہیں جو اس کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں۔ پس نبیؑ کے مشابہ اشخاص بھی نبی جیسا کام نہیں کرسکتے، عوام تو درکنار اتو فہم قرآن اور توضیحِ جزئیات اور قوانین کی حدود وکیفیات کے بیان میں نبی کی پیروی لازم اور ضروری ہوگی۔

نبیِ کریمؐ کی بشریت کو قرآن نے جس قدر مقامات پر بیان کیا ہے وہ اوصاف خداوندی کے مقابلہ میں ہے۔ قرآنِ پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص

آنحضرت صلعم کی بشریت کا اعلان ہے مگر ہر جگہ توحیدِ کامل کے بیان اور خُدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدۂ باطل کی تردید میں ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہیئے کہ وہ خُدا سے زبردستی کسی بات کو منوا لیں اور سعی و سفارش کر کے قصور معاف کرا دیں۔

پس اعلانِ بشریت درحقیقت اس غلط عقیدہ کے مٹانے کے لیے تھا جو انبیاءؑ کی "شانِ الوہیت" کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا، اور بے حد افسوس کا مقام ہے کہ اس قسم کا غلط خیال آج کل اس نبی کی امت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے، جو دنیا میں توحیدِ کامل کا مبلّغ بن کر آیا تھا۔ دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبرؑ اور عام انسانوں میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کوئی بلندی اور برتری حاصل ہے۔ اِلّا یہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں گویا اس کا منشاء یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لمحہ اور آن میں منصبِ نبوت کا امتیاز پاتا ہے جب اس پر کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس سے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک اور مختصر فرقہ نے دعویٰ کیا کہ "پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحیِ قرآنی کی صورت میں آیا۔ اس کے علاوہ آپ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی اُمور ہیں، جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے نہ اسلام کا جزء۔ یہ خیالات دوسرے مفرطانہ فرقہ کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں اور حقیقت اِن کے بَین بَین ہے۔

صحیفۂ ربّانی اور کتاب اللہ

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں جس کتاب کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی ہے اور ایسی آخری اور ابدی کتاب کیلئے یہ ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر شریعت کے کلّی اور ابدی اصول و مبادی پر زور دے۔

چنانچہ اس آخری وحیِ الٰہی نے اپنی کتابِ الٰہی کو صرف اصول و کلّیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لیے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے ہیں جن کے سہارے وہ دل جو علم و معرفت سے پُرنور اور علم و حکمت سے معمور اور شرح صدر و تائید القاءِ رَبّانی سے فیض یاب ہوں، وہ علیٰ قدرِ مراتب جزئیات کو صحیح طور پر جان لیں چنانچہ یہ رُتبہ سب سے پہلے خود نبیِ کریمؐ کو ملا۔ اور چونکہ آپ خطا سے معصوم ہیں اِس لیے آپ کے اِس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں۔ پھر رسول کے وسیلہ سے یہ رُتبہ خلفائے راشدین، اکابرِ صحابہؓ، ائمۂ تابعین اور تبع تابعین، مجتہدینِ عظام اور علمائِ اعلام کو ہمیشہ کے لیے ملتا رہا۔ اس کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے۔ جس کو ہر زمانہ میں فیضیابِ علومِ نبوّت اور عاملینِ اسرارِ شریعت خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق، اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے اور دیتے رہیں گے۔ یہی سبب ہے کہ خدا نے قرآن کی توضیح و تفسیر کی ذمّہ داری بھی خود اپنے اُوپر لی ہے۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (یعنی پھر ہمارے ذمّہ ہے اس کی شرح کرنا۔

اِس بیان اور شرح کی ذمّہ داری کبھی بذریعہ وحی اَدا ہوئی ہے جو قرآن میں مذکور ہے اور کبھی رسولؐ کی تقریر و عمل سے پوری ہوئی جو عملی تواتر سے منقول اور احادیث کے مُستند و معتبر دفتر میں موجود ہے۔

یہ امر کہ اس بیان و شرح کی طاقت اور اس تفسیر و توضیح کا اختیار رسولؐ کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا، ذیل کی آیت سے ثابت ہے۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (ہم نے آپ کی طرف یہ نصیحت (کی کتاب) نازل کی، تاکہ لوگوں کی طرف جو نازل کیا گیا ہے، آپ اس کو کھول کر بتا دیں، شاید وہ سوچیں)

" بیان اور تبیین " کے لفظی معنیٰ کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں۔ اور استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے۔ ایک اعلان اور اظہار کے معنیٰ میں یعنی اخفار کے مقابل۔ دوسرے توضیح و تفسیر کے معنیٰ میں۔ قرآن میں یہ لفظ دونوں معنوں میں آیا ہے لیکن غور و فکر کے مقابلہ کے باعث یہاں توضیح و تشریح کے معنیٰ ہونا یقینی ہیں۔ جب قرآن عربی زبان میں ہے اور اہلِ عرب عربی سمجھتے تھے پھر تفسیر و توضیح کی کیا حاجت؟ لہٰذا معلوم ہُوا کہ کتابُ اللہ کے محض لفظی معنی سمجھنے سے اس کا صحیح علم حاصل نہیں ہوتا۔ اسی لیے نبی کو وضاحت کا حکم ہوا۔ اور جو توضیح کہ نبی کے بیان سے ہو، اس کا نام "حدیث و سنّت" ہے۔

حدیث و سنّت

حدیث سے مُراد حضور صلعم کے تمام اقوال و افعال، اور دوسروں کے وہ اعمال ہیں جن کو آپؐ نے برقرار رکھا۔ حدیث صرف قولِ رسولؐ کا نام نہیں، بلکہ قولِ رسولؐ کو بھی کہتے ہیں اور فعلِ رسولؐ کو بھی اور تقریرِ رسولؐ کو بھی۔ تقریر کے معنیٰ کسی کے فعل کو برقرار رکھنا۔ یعنی کسی کو کرتے دیکھ کر اس کو منع نہ کرنا۔ بلکہ احادیث کی رُو سے قولِ صحابی اور فعلِ صحابی اور تقریرِ صحابی بھی حدیث کے ساتھ ملتے ہیں۔ گو درجات اور وقتِ اختلاف ترجیح میں علمار باہم مختلف ہوں، اور مختلف قواعد و ضوابط پر عمل پیرا ہوں۔

نبیِ کریمؐ کو حق تعالےٰ نے صرف احکامِ خداوندی کے پہنچانے کے لیے مبعوث نہیں فرمایا، بلکہ تعلیمِ کتاب، تعلیمِ حکمت اور تزکیہ کی خدمت بھی سپرد کی۔ دوسرے لفظوں میں عملی صورت سکھلانے کے لیے مبعوث فرمایا۔ بلا بعثتِ نبی دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی اور ہر عملی صورت کو صحیح جامہ پہنانے کے لیے تین ہی چیزوں کی حاجت ہے، قولؔ، فعلؔ اور تقریر۔

مثلاً فنِ خوشنویسی میں کتابیں موجود ہیں۔ لیکن کتابوں سے یہ فن اور نہ کوئی دوسرا عملی فن حاصل ہو سکتا ہے بلکہ اس کی حاجت ہے کہ استاد زبان سے بھی بتائے اور اپنے ہاتھ سے لکھ کر اور شاگرد کے ہاتھ سے بنوا کر حرفوں کی صورت ذہن نشین کرائے، حتیٰ کہ جب شاگرد کا ہاتھ صاف ہو جائے تو اس کے لکھے ہوئے حرفوں پر سکوت کرے۔ پس زبانی بتانا حدیثِ قولی کی نظیر، اور اپنے ہاتھ سے لکھ کر دینا حدیثِ فعلی کی اور شاگرد کے لکھے ہوئے حرفوں پر سکوت تقریری حدیث کی مثال ہے جسطرح خوشنویسی کی تعلیم ان تین طریقوں کے بغیر نہیں ہو سکتی، دین کی تعلیم بھی ان تین طریقوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ :

حق تعالےٰ سُبحانہٗ نے خود قرآن کی بابت ارشاد فرمایا ہے تَفْصِیْلًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کہ اِس کتاب میں ہر شئے کی تفصیل اور بیان موجود ہے۔ تو ایسی حالت میں قرآن کو حدیث کی حاجت وضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور قرآنِ پاک کو تعلیمِ نبی اور تعلیمِ حکمت کا محتاج ماننا اس کے منافی ہے۔ تو جواباً عرض ہے کہ :

یہ بالکل واقعی اور نفس الامری بات ہے کہ قرآنِ پاک مکمل کتاب ہے، لیکن یہ بھی بدیہی بات ہے کہ قرآن سمجھنے کے لیے بہت سے آلات اور علوم کی حاجت ہے

عربی زبان، لغت، صرف و نحو، معانی و بیان وغیرہ کے ہم محتاج ہیں کہ بغیر ان علوم میں دستگاہ پیدا کیے، فہم و تفہیم قرآن ناممکن ہے۔ جس طرح ہر علم میں بلا مبادی و مقدمات کے اس علم کی تحصیل ناممکن ہے جو حال اشیاءِ محسوسات کا ہے کہ آلات کے بغیر ان اشیاء کا حصول ممکن نہیں، اسی طرح اور بالکل اسی طرح علوم کی حالت ہے کہ مبادی و مقدمات کے بغیر ان کا حصول بھی ممکن نہیں۔ جس طرح اقلیدس کی شکلوں کا اصولِ موضوعہ کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں، یہی حال جملہ مبادی کا ہے۔ جیسے ہم معانی سمجھنے کے لیے مبادی کے محتاج ہیں، اسی طرح منشاءِ خداوندی معلوم کرنے کے لیے نبیِ کریمؐ کے محتاج ہیں۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال و تقریر میں منحصر ہے اور اسی کا نام حدیث ہے کیونکہ حضورؐ سے زیادہ کوئی خداوندِ تعالےٰ کے منشاء کو سمجھنے والا نہیں ہو سکتا، اور ہمارے علم اور ہماری فہم و فراست میں تفاوت ہے۔ اس لیے ایک حکم کی ضرورت ہے اور وہ رَدّ اِلَی الرسول ہے۔ اور پھر تفصیل کل شئی اور تبیان کل شئی اور قرآن پاک کا کامل و مکمل و جامع ہونا کب اِس امر کو مقتضی ہے کہ اس میں تمام جزئیات کا احاطہ کیا گیا ہو۔ تمام جزئیات کی تفاصیل موجود ہوں۔ توریت کی نسبت قرآن میں ارشاد ہے وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہم نے الواحِ توریت میں ہر قسم کی نصیحت اور تمام اشیاء کی تفصیل لکھ دی تھی۔

تو کیا کسی کی عقل اور انسانی تصور اس کو باور کر سکتا ہے کہ اس الواح میں دنیا بھر کی چیزیں لکھی جا سکتی ہیں، ہرگز نہیں۔ كَلَّا وَاللّٰهِ لَا يُمْكِنُ ذٰلِكَ۔

کسی کتاب کے جامع ہونے کا مفہوم ہی یہ ہوتا ہے کہ اس میں مختلف جزئیات کے احکام بہ شکل کلیات اور قواعد موجود ہوں اَلْقُرْاٰنُ عَلٰى اِخْتِصَارِهٖ جَامِعٌ وَلَا يَكُوْنُ

جَامِعًا اِلَّا وَالْمَجْمُوْعُ فِیْہِ اُمُوْرٌ کُلِّیَاتٌ۔

(قرآنِ کریم مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اور یہ جامعیت اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس میں کلیات مذکور ہوں۔)

امام بخاریؒ کا ارشاد ہے:

وَبَلَغَنِیْ اَنَّ جَوَامِعَ الْکَلِمِ اَنَّ اللّٰہَ یَجْمَعُ الْاُمُوْرَ الْکَثِیْرَۃَ الَّتِیْ کَانَتْ تُکْتَبُ فِی الْکُتُبِ قَبْلَہٗ فِی الْاَمْرِ الْوَاحِدِ اَوِ الْاَمْرَیْنِ اَوْ نَحْوِ ذٰلِکَ (بخاری باب المفاتیح)

(کہ جوامع الکلم کی مجھے یہ تفسیر معلوم ہوئی کہ جو باتیں اللہ تعالیٰ نے پہلی کتابوں میں بہت سے پھیلاؤ کے ساتھ بیان فرمائی تھیں، وہ ایک دو جملوں ہی میں جمع کر دی)

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ اس کے بعد اب تفصیل و شرح کی حاجت نہیں، یا وہ اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے کسی معلم و مفسر کی حاجت باقی نہیں رہی۔ بلکہ یہ مفہوم ہے کہ وہ خدا شناسی اور آدابِ عبدیت اور حقوقِ ربوبیت و رسالت کے جملہ اصول پر حاوی ہے۔

پس قرآن کی شانِ جامعیت، تشریحاتِ حدیث سے ہرگز بے نیاز نہیں کرتی، بلکہ احادیث کے بغیر قوانینِ قرآنی کی اشکال و کیفیات، شرائط و جزئیات کا علم ہی نہیں ہو سکتا۔ ایک عجیب حیرت انگیز امر ہے کہ جب حدیث کا انکار مقصود ہوتا ہے تو قرآن اس قدر مفصل بن جاتا ہے کہ قرآن فہمی کے لیے مبادی اور شروط کی بھی ضرورت نہیں رہتی نحوی تبیان اور کامل و مکمل ہو جاتا ہے اور ہر چیز کی تفصیل اس میں مندرج نظر آنے لگتی ہے۔ وہ کسی بیان کا محتاج نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ نبی کے بیان سے بھی مستغنی ہو جاتا ہے (اگو پرویزی بیان کا محتاج رہے)

اور جب مسئلہ دستور اور قانون کا پیش آتا ہے تو سارا قرآن دستور سے خالی نظر آنے لگتا ہے۔ تیس پاروں میں ایک آیت بھی نظر نہیں آتی۔ یہ بات ہمارے نظریہ اور عقیدہ کے عین مطابق ہے۔ اس لیے کہ قرآنی علوم و ہدایات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کے چشمہ اور ائمہ مجتہدین کے فریم کے بغیر سمجھنا اور اس کی روح تک پہنچنا ممکن نہیں۔

امام شافعیؒ نے کتاب الرسالہ میں احادیث سنن کی کُل تین۳ قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک۱ وہ جو بعینہٖ قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ دوسری۲ وہ جو قرآن کے مجمل حکم کی تشریح کرتی ہیں۔ تیسری۳ وہ جن کا ذکر (بظاہر) قرآنِ پاک میں نہ تفصیلاً ہے نہ اجمالاً۔ اور یہی تیسری قسم محلِ بحث ہے۔ امام صاحبؒ نے ائمہ سلف کے چار نظریے نقل کیے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے رسولؐ کی کلی اطاعت فرض کی ہے۔ اور اُس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسولؐ جو کچھ کہے گا اور کرے گا رضائے الٰہی کی توفیق اس کیساتھ شامل ہو گی۔ حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی سے رسولؐ کو یہ توفیقِ ربانی عنایت کی گئی ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو تلاش کرے۔

(۲) رسولؐ نے کوئی حکم ایسا نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو۔ مقصود یہ ہوا کہ اس قسم کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ سے ماخوذ ہیں اگو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے۔

(۳) تمام احادیثِ نبوی "اِلقاء فی الروع" ہیں۔ یعنی رسولؐ کے دل میں خدا تعالےٰ نے ڈال دی ہیں اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہے جو آپؐ کے دل میں ڈالی گئی۔

(۴) اِس قسم کے تمام اُمور جو احادیث میں ہیں کتابِ الٰہی سے جُداگانہ مستقل پیغام

ربانی کے ذریعہ رسولؐ کو معلوم ہوئے ہیں۔

علم وحی اور عملِ نبوّت

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین نظریے ایک ہیں۔ پہلے نظریہ کا منشاء یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے۔ اس کو ابتداء ہی سے ایک توفیقِ ازلی بھی عنایت ہوتی ہے۔ جس سے وہ پیش آمدہ اُمور میں رضائے الٰہی کو دریافت کر کے فیصلہ کرتا ہے۔ تیسرے نظریے میں اسی توفیقِ علم کو الہام اِلقاء فی الروع اور دل میں ڈالنے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے نظریہ کا منشاء یہ ہے کہ رسولؐ کے جو احکام بظاہر کتابُ اللہ میں نہ ہوں، اُن کی اصل بھی درحقیقت کتابُ اللہ میں ہے اور رسولؐ اسی اصل سے اپنے احکام کو مستنبط کرتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط عام انسانی اور بشری فہم سے نہیں ہوتا۔ ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا۔ بلکہ وہ پیغمبرانہ قوتِ فہم کا نتیجہ ہوگا۔ اور جب ایسا ہے تو اس پیغمبرانہ قوتِ فہم کی تعبیر خواہ "الہام" سے کرو، "القاء" سے کرو، یا اس کو حکمتِ نبوی کا نتیجہ کہو یا توفیق، بات ایک ہی ہوئی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بعید نہیں، بلکہ سب آراء اور نظریوں سے انسب ہے کہ رسولؐ کے تمام صحیح زبانی احکام بھی اس کے صحیفۂ ربانی سے ماخوذ و مستنبط ہیں، اور اُن کی جزئیات کتابِ الٰہی کی کلیات کے تحت مندرج ہیں اور رسولؐ کا اخذ و استنباط اور فہم اُس کی اس پیغمبرانہ قوتِ علم کا نتیجہ ہیں جن کو حکماء ملکۂ نبوّت اور اہلِ شرع حکمت الہام اور شرحِ صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو خطا و غلطی سے یکسر پاک ہے۔

"احادیث قرآن کا بیان ہیں"

قرآنِ پاک اور احادیثِ صحیحہ پر جن کی عمیق اور وسیع نظر ہے اُن

کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیثِ صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآنِ پاک کے عمومی اور کلی احکام کے تحت مندرج ہیں۔ اگرچہ اس اندراج میں علماءؒ کے تین نظریے ہیں۔

پہلا اور عمومی نظریہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے بہت سے مقامات پر جناب نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا خصوصاً اور جملہ انبیاءؑ کی اطاعت کا عمومی حکم دیا ہے۔

چنانچہ ایک رکوع میں اٹھارہ انبیاءؑ کے ذکر کے بعد ارشادِ خداوندی ہے،

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ — "یہ وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی، اے محمد (صلعم) تو بھی انہی کی رہنمائی کی پیروی کر"۔

اِس پورے رکوع میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر ان کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں، اگر ہم اُن کو یکجا کر دیں تو نبوّت اور رسالت کے عام اوصاف، خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں۔

چنانچہ رکوع کا ہم نے جو جملہ لکھا ہے، جس کا حاصل ہے کہ ان کی رہنمائی کی پیروی کر۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی سے نیکوکار اور صالح بنتے ہیں، پس اگر رسولؐ کو قاصدِ محض فرض کیا جائے تو اِس حکم کا کیا مقصد ہوگا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ؕ — تمہارے لیے رسول اللہ میں اسوۂ حسنہ ہے یعنی آپؐ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔

متعدد آیات میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا حکم ہے، اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔

ایک آیت میں ہے وَ اِنْ تُطِیْعُوْہُ تَہْتَدُوْا ؕ اگر رسولؐ کی اطاعت کرو گے تو کامیاب ہو گے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ ؕ	"ہم نے آپ کے پاس حق کتاب نازل کی، تاکہ آپ لوگوں کے درمیان، جو اللہ تعالیٰ آپ کو سوجھائے اُس کے ذریعہ فیصلہ کریں۔"

کتاب کے ساتھ اور کتاب کے ذریعہ فیصلہ کو نہیں فرمایا، بلکہ ارادتِ خداوندی کے ذریعہ۔

فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَہُمْ۔	"قسم ہے تیرے رب کی، وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھے اپنے جھگڑوں کا منصف نہ بنائیں۔"
ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ؕ	"اور پھر آپ جو فیصلہ فرما دیں، اس سے اپنے دل میں تنگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم نہ کریں۔"
وَ مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَۃٍ اِذَا قَضَی اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ	"کسی مسلمان مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اُس کا رسولؐ فیصلہ کر دے، تو اُن کو اپنے کام کا اختیار

لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ رہے اور جس نے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی کی وہ کھلا گمراہ ہوا۔"

یہ اطاعت اور مطلق سرافگندگی اور تمام فیصلوں کا قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربّانی ذمہ داری ہر حاکمِ وقت اور سلطانِ زمانہ کے لیے نہیں، یہ انبیائؑ کے لیے خاص ہے۔ دو شخصوں کا باہمی جزئی اور شخصی فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالےٰ وحی قرآن کے ذریعہ نہیں کرتا تھا، بلکہ رسولؐ کی فہم نبوّت، نورِ نبوّت، فیضِ حکمت، شرحِ صدر، تبیینِ حقیقت اور ارادت کے ذریعہ کرتا تھا، لیکن کلّیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحیِ قرآن کے مطابق ہوتا تھا۔ اور ان کلّیات کے مطابق جزئیّات کا فیصلہ خود اللہ تعالےٰ آپ کو سُجھاتا تھا۔

آپؐ کے اِن فیصلوں اور قضایا کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک بحکم قرآن لازم اور ضروری ہے۔ آپؐ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وُہی فیصلے جاری کریں جو آپؐ نے اپنی زندگی میں اِس طرح کے معاملات میں کیے، کیونکہ آپ کے فیصلے بحکم خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزّہ تھے اور دنیا میں رسولؐ کے سوا کسی انسان کو اِس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رُتبہ حاصل نہیں۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم اور ہر ممانعت بحکم قرآن واجب الاطاعت ہے:

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ ۝ "جو تم کو رسولؐ دیں اس کو لو اور جس سے منع کریں اُس سے بچو!"

اِس آیت میں بعض حضرات کا یہ کہنا کہ "یہ آیت مال کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ "اِیتَاءُ" مال ہی کے لیے مستعمل ہوتا ہے"۔ صریح اور فاش غلطی ہے۔ لغتِ عربی تو کیا مساعدت کرتا خود قرآن میں "اِیتاءِ" مال اور غیر مال کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ توراۃ کے عمل پر ارشادِ خداوندی ہے، خُذُوا مَا اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ اور اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتَابَ وَتِلْکَ حُجَّتُنَا اٰتَیْنٰھَا اِبْرٰھِیْمَ عَلٰی قَوْمِہٖ بیسیوں نظائر اِس دعوے کے مخالف ہیں۔

اسی طرح اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ پر یہ کہنا کہ اس سے خداوندی اور خدا کے کتابی احکام کی اطاعت مُراد ہے۔ اگر بالفرض اس کو تسلیم کریں تو تمام قرآن میں اَطِیْعُوا اللّٰہَ کے ساتھ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کیوں ذکر کیا گیا اور اکثر مقامات پر تکرارِ "اطیعوا" کے ساتھ، جس سے صاف واضح اور روشن ہوتا ہے کہ یہ دو مستقل اطاعتیں ہیں۔ ایک ضمن میں کتابِ الٰہی کے اور ایک ضمن میں احکامِ رسول ؐ کے، اور بعض مقامات پر تو صرف رسول ؐ ہی کی اطاعت کا ذکر ہے، وہاں تو اطاعتِ خداوندی کے بارے میں ذکر ہی نہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خُدا کی اطاعت بلا اطاعتِ رسول ؐ ممکن ہی نہیں، اِسی طرح قرآن پاک نے ارسالِ رسول ؐ کی غرض و غایت ہی اطاعت بتلائی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ط

انبیاء و رسل ؑ کی بعثت کی غرض قرآن پاک نے کتابِ الٰہی کا لوگوں تک پہنچا دینا کہیں ذکر نہیں کیا۔ جس سے ایک ادنیٰ فہم والا انسان یہ باطل تصور اور یہ غلط خیال جما سکتا تھا کہ نبی خدا تعالیٰ اور بنی آدم کے درمیان قاصدِ محض ہوا کرتا ہے۔

انبیاءؑ کے بعثت کی سب سے پہلی غرض و غایت قرآن پاک نے اُس روزِ الست کے بھولے ہوئے عہد کی یاد دہانی بتائی۔ اِس کے بعد رسولؐ کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے کہ ان کا وجود بنی آدم پر اتمامِ حجت ہو۔ ممکن ہے کہ آدمؑ کے فرزند بجا عذر کریں کہ ہم کو کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ

"رسولؑ خوش خبری سنانے والے ڈرانے والے ہیں، تاکہ رسولوںؑ کی آمد کے بعد لوگوں کے لیے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔"

"تذکیر" کے بعد نبی کا فرضِ اوّلین "ہدایت و رہنمائی" ہے۔ کیونکہ انبیاء و رسلؑ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہادی کے مظہر اور مُورد ہیں۔ اِسی لیے ایک آیت میں نبی اور رسلؑ کے لیے "ہادی" کا لفظ آیا ہے۔

وَلِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ اور ہر قوم کیلئے ایک راہ دکھانے والا آیا۔

سورۂ شوریٰ میں فرمایا وَ اِنَّکَ لَتَھْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔ یقیناً آپؐ سیدھی راہ دکھاتے ہیں۔

سورۂ انبیاء میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے

وَجَعَلْنٰھُمْ اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا۔

"اور ہم نے اُن پیغمبروں کو پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے راہ دکھلاتے ہیں۔"

اِسی طرح اُن آسمانی کتابوں کو جو لوگوں کو دی گئی تھیں، بار بار "ہُدیٰ" ہدایت کہا گیا۔ اور کہیں اُن کو ضیاء، نور اور روشنی کے الفاظ سے یاد کیا گیا۔ پس انبیاءؑ

کے ہادی ہونے کو لازم اور ضروری ہے کہ ان کی ہدایت کی اتباع و پیروی کی جائے، اور یہ بلا اطاعتِ اقوال و افعال اور احوال ممکن نہیں۔ پس جب قرآن نے صحیفۂ ربانی کو بھی ہادی فرمایا اور انبیاء اور نبی کریمؐ کو بھی ہادی فرمایا۔ تو معلوم ہوا کہ حصولِ ہدایت کے لیے دونوں کا اتباع ضروری اور لازمی ہے بلکہ قرآن نے نبی کے اتباع و اطاعت کو عین خدا کی اتباع اور اطاعت قرار دیا ہے۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ ۔ "کہیے اگر تم حق تعالیٰ کو محبوب رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔

اِس آیت میں فَاتَّبِعُوا الْقُرْاٰنَ نہیں فرمایا۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا حکم فرمایا، تو معلوم ہوا کہ حضورؐ کا اتباع قرآن سے زائد امور میں بھی امّت پر لازم ہے اور اتباع اقوال میں ہوتا ہے اور افعال میں بھی، اور اسی مجموعہ کا نام حدیث وسنّت ہے، اور جگہ تو بالکل صریح اور صاف طور پر فرمادیا:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ۔ "جو رسولؐ کی اطاعت کرے اُس نے خُدا کی اطاعت کی۔"

بخاری ومسلم کی حدیث میں ہے:

مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ ۔ جس نے میری اطاعت کی اُس نے خُدا کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے خُدا کی نافرمانی کی۔ الحاصل انبیاءؑ کی ہدایت اور رہنمائی سے استفادہ کی ایک ہی صورت ہے اور وہ اُن کی کماحقہٗ اطاعت و پیروی ہے۔ دوسرا مفہوم اِس پیروی کا یہ ہے کہ وہ بندگانِ الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں۔

انسان جن فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہوجاتا ہے۔ انبیاءؑ ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے نور میں لاتے ہیں، اُن کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق، ظلمت کی جگہ نور عطا کرتے ہیں۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ احادیث وسنّت واقوال وافعال اور احکامِ رسول اللہ صلعم کا واجبُ الاتباع ہونا اِس بناء پر ہے کہ قرآن نے ہر نبی کے اتباع کو ضروری قرار دیا ہے اور یہ خاصہ لازمۂ نبوّت سے ہے۔ پھر بہت سے مقامات پر نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ والتسلیم کی اطاعت اور اتّباع کا خصوصیّت سے حکم دیا ہے اور یہ کہنا کہ اتباع واطاعت کا حکم حاکم اور امام ہونے کے باعث ہے، نبوّت ورسالت کے باعث نہیں۔ اس لیے عقل باور نہیں کرسکتی کہ اکثر مقامات پر اس حکم کو منصبِ رسالت پر منطبق کیا گیا ہے، جو صاف بتلاتا ہے کہ علّتِ حکم نبوّت ورسالت ہے نہ کہ حکومت وامامت۔ نیز قرآن نے ہر رسول کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے اور حاکم ہونے کے مستحق صرف سلیمانؑ اور داؤدؑ ہیں۔ اور کسی توجیہہ سے یوسفؑ و موسیٰؑ کو بھی شامل کرلیجیے۔ لبقیہ انبیاءؑ کو تو اس کا کوئی حصّہ ہی نہیں ملا۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قیامِ مکّہ میں اطاعت واجب نہ تھی۔ پھر خود قرآن نے حاکم کی اطاعت کو رسول کی اطاعت کے بعد ایک مستقل اور اطاعتِ رسول سے ایک جُدا اور مستقل فرد قرار دیا ہے۔ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ میں۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ:

قرآنِ مجید مجمل ہے، احادیث مُوضِح ہیں۔ یعنی قرآن کے احکام نفسِ عمل کی

کیفیات، اُن کے اسباب، اُن کے شروط اور اُن کے موانع کے لحاظ سے مجمل ہیں اور احادیث میں اُن کی توضیح ہے۔ مثلاً نماز اور زکوٰۃ کی تشریح قرآنِ مجید ہی کی توضیح ہے۔ قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق و وسیع نظر ہے اُن کو برملا یہ معلوم ہوتا ہے کہ احادیثِ صحیحہ کے تمام فرعی جزئیات و احکام قرآن پاک کے عمومی اور کلّی احکام کے تحت مندرج ہیں۔ آنحضرت صلعم نے اپنے الفاظ میں صرف اُن کی تشریح فرمائی ہے اور یہ تشریح ارادتِ الٰہی اور نورِ بصیرت اور ملکۂ نبوت وغیرہ خصوصیات کے باعث ہے، اِس لیے واجبُ الاتّباع ہے۔

اِس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں۔ ایک[1] وہ جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآنِ پاک کی کوئی آیت اُس کے ساتھ پڑھ دی۔ اِس امر اور اس کی نوعیت میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے؟ دوسری[2] شکل یہ ہے کہ آیت تو آپؐ نے نہیں پڑھی مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرما دیئے ہیں جو کسی آیت کا جزء ہیں۔ جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے۔ اس صورت میں بھی اصل و فرع کی تمیز اہلِ علم کیلئے آسان ہے۔ تیسری[3] شکل یہ ہے کہ آپؐ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر حکم فرما دیا۔ اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقتِ نظر کا کام ہے۔ ان کا پتہ زبانِ نبوّت اور فہمِ رسالت کے طرز و اسلوب کے سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی پا سکتے ہیں۔

انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جا سکے جو ایک طرف اختلافِ فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات

کی کوئی حد نہیں، پوری طرح حاوی ہو۔ لیکن فہمِ انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمام تر دُور نہیں کیا جا سکتا، تاہم ان کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے اپنے قانونِ الٰہی سے جو بہرحال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے، اس اختلافِ فہم کے نقص کو کم کرنے کے لیے یہ کیا کہ اپنے رسولؐ کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح کرا دی۔ گو انسانی ذرائعِ حفظ و روایت کی فطری کمزوریوں کے باعث اِس تشریح و تبیین میں بھی اختلافِ فہم پیدا ہو گا لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیج اس سے بھی زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی اور اگر موجودہ خیالات اور اوہام کے ماتحت ہر امام اور حاکمِ وقت کے متعلق فہمِ قرآن اور جزئیات کی تشریح و توضیح سپرد ہوتی تو ہوا اور خواہشات کے اختلاف کے باعث دین کی صورت کا بقا بھی ناممکن تھا۔

روزمرّہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت صلعم کی عدالت میں روزانہ اِس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہتے اور آپؐ وحیِ کتاب کے اصول و کلیات کے ماتحت اپنی نورِ بصیرت اور فہمِ حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہتے۔ خلفاءِ راشدین نے اپنے اپنے عہد میں ان نو بہ نو اور تازہ بہ تازہ واقعات کے فیصلوں کے لیے اوّلاً وحیِ کتابی کو، اور اس کے بعد آنحضرت صلعم کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہمِ نبوّت اور نورِ بصیرت اور ارائتِ الٰہی کے ذریعہ فیصل ہوئے تھے، اپنا ماخذ قرار دیا اور اِسی اصول کو بعد کے فقہاء اور مجتہدین نے اختیار کیا اور ہر نئے واقعہ کو وحیِ کتاب اور فیصلۂ نبوی کے معلوم و مسلّم معیار پر جانچ کر اُن میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ پر قیاس کر کے

اپنے فیصلے دیئے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں، اُن کو معروف عدل و انصاف و رسم و رواج و عقل و فکر و استحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا۔ یہی مجموعہ آج فقہِ اسلامی کہلاتا ہے۔

وحیِ الٰہی قرآنِ پاک میں ہے اور آنحضرت صلعم کے قضایا اور فیصلے احادیث و سنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں۔ وحیِ الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہو سکتا، اب رہ گئی آنحضرت صلعم کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی تو اس کے متعلق بھی وحیِ الٰہی ناطق ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ	"ہم نے آپؐ پر سچائی کے ساتھ کتاب
لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ	اُتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو اللہ
بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ۔	آپؐ کو سوجھائے، اس کے ذریعے
	فیصلہ کریں"۔

اِس کتابِ الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ اے پیغمبرؐ آپ اس کے احکام اور قوانین کو لے کر، اس فہم کے ذریعے جو اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھائے اور دکھائے، آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کیجئے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبرؐ کو یہی سوجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا وہ آپؐ کے عمل اور قضایا اور فیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے اور اسلام کے قانون کا وحیِ الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

آنحضرت صلعم کے عدل و انصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا۔ چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب اُن کا حق کسی پر ہوتا تو وہ دَوڑے ہوئے عدالتِ نبوی میں حاضر ہوتے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپؐ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا۔ لیکن جب اُن

پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقے سے فیصلہ چاہتے۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی متعدد آیات میں ان کی سرزنش کی۔ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ اِلٰی قَوْلِهٖ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۔

اِن آیات سے معلوم ہوا کہ رسولؐ کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسولؐ کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے، بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے۔ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ قسم ہے آپ کے خدا کی، وہ مومن نہ ہوں گے، جب تک وہ آپؐ کو اپنے تنازعات کا منصف نہ بنا دیں اور آپ جو فیصلہ کریں، اُسے پوری طرح تسلیم نہ کریں۔

یہ اطاعت اور مطلقاً سرافگندگی اور تمام فیصلوں کا قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حاکمِ وقت اور سلطان اور امامِ زمانہ کے لیے نہیں، یہ انبیائؑ کے لیے خاص ہے۔ دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ بدیہی اور ظاہر بات ہے کہ خود حق تعالیٰ وحیِ قرآن کے ذریعہ نہیں فرماتے تھے بلکہ رسولؐ کی فہمِ نبوت، نورِ نبوت، فیضِ حکمت، شرحِ صدر تبیانِ حقیقت اور اراءت (سوجھانے) کے ذریعہ فرماتا تھا لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحی قرآن کے مطابق ہوتا تھا۔ اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا خود اللہ تعالےٰ آپ کو سوجھاتا تھا۔

آپ کے اِن فیصلوں اور قضایا کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر تاقیامت ضروری ہے۔ آپؐ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں، جو آپؐ نے اپنی

زندگی میں اس نوعیت کے معاملات میں کیسے کہ آپؐ کے فیصلے بحکم خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزّہ تھے اور دنیا میں رسولؐ کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رُتبہ حاصل نہیں۔

کتاب و حکمت کی تعلیم

حضرت ابراہیمؑ نے آنحضرت صلعم کے ظہور کی یہ دُعا بارگاہِ خداوندی میں مانگی تھی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ	"اے ہمارے پروردگار اور ان میں ایک رسول بھیج، جو اُن کو تیری آیتیں سُنائے، اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو سنوارے۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا قبول فرمائی:

كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۚ	"جس طرح اُس نے تم میں ایک رسول بھیجا، وہ تم کو ہماری آیتیں سُناتا اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔"

اس دُعائے ابراھیمی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا احسان، اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران کے سترھویں رکوع میں مومنین پر فرمایا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ۔	"درحقیقت اہلِ ایمان پر تو اللہ تعالیٰ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اُٹھایا، جو اس کی آیات انہیں سُناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی احسان انہی الفاظ میں سورۃ جمعہ میں دُہرایا ہے، اور سورۃ نساء میں بھی آنحضرتؐ کو مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا ہے:

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ "اور خُدا نے آپ پر کتاب اور حکمت اُتاری۔"

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے:

وَاَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ وَالْحِکْمَۃِ اور اُس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اُتاری ہے۔"

خاص طور سے ازواج مطہرات کو خطاب ہے:

وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ ۔	"اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سُنائی جاتی ہیں اُن کو یاد رکھو۔"

اُوپر کی تین آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین کاموں کا ذکر ہے:

(۱) خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دوسروں کو سُنانا۔

(۲) ان کو شرک اور بداخلاقی کی نجاستوں سے پاک وصاف کرنا، اور سنوارنا۔

(۳) ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلا اور تیسرا کام ایک ہی معنیٰ رکھتا ہے یا دو؟ اگر ایک ہی معنی رکھتا ہے، تو اس سے بے سود تکرار کا فائدہ کیا؟ کیوں نہ دوسری جگہ بھی "یتلوا" یعنی تلاوت کا لفظ رکھ دیا گیا، اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتے ہیں جیساکہ ہر صاحبِ نظر سمجھ سکتا ہے، تو اِن دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ہوگا۔ اگر رسولؐ کا فرض محض وحی کی زبان سے سُنی ہوئی آیتوں کو پڑھ کر دوسروں کو سُنا دینا ہے اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہوجاتا ہے، تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے۔ بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے۔ خصوصاً جب کہ لفظِ تعلیم تلاوت کے بعد آتا ہے۔ وحی کے الفاظ سُنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہوجاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہ جاتا ہے۔ کتاب کی تعلیم کے معنیٰ تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ سُنا دینا اور پڑھا دینا اور دوسروں کو یاد کرا دینا نہیں، بلکہ الفاظِ قرآن کے تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا، اس کے مشکل مطالب کا حل کرنا، مجمل معانی کا سمجھانا اور اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح وتفصیل کر دینے کا نام کتاب وحکمت کی تعلیم ہے اور یہ آپؐ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا، اور یہی وہ تعلیم تھی جس کا اِن آیتوں میں بار بار ذکر ہے۔ بالخصوص آیت ۶ میں محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کو آیاتِ الٰہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم ہے؟ اب اگر وہ باتیں امورِ دین سے متعلق نہ ہوتیں تو ان کے لیے ان کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا؟

اب جب اِن مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائضِ نبوت میں داخل تھی تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی۔ اور اس کی تعمیل بھی اُمت کے لیے ضروری ہوگی۔ اور آپ کی اس زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہ اور تابعین نے اپنی روایت اور عمل سے محفوظ رکھا اور وہ سُنن اور احادیث کے نام سے موسوم ہے۔ رہ گیا یہ سوال کہ حکمت کس کو کہتے ہیں، لغاتِ قرآن کے مشہور امام "راغب اصفہانی" مفردات القرآن میں فرماتے ہیں:

وَالْحِكْمَةُ اِصَابَةُ الْحَقِّ بِالْعِلْمِ	"اور حکمت علم و عقل سے سچی اور
وَالْعَقْلِ فَالْحِكْمَةُ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى	صحیح بات کو جاننا ہے تو اللہ تعالےٰ
مَعْرِفَةُ الْاَشْيَاءِ وَاِيْجَادُهَا عَلٰى	کی حکمت چیزوں کا جاننا اور ان کو
غَايَةِ الْاِحْكَامِ وَمِنَ الْاِنْسَانِ	بکمال خوبی پیدا کرنا ہے اور انسان
مَعْرِفَةُ الْمَوْجُوْدَاتِ وَفِعْلُ الْخَيْرَاتِ	کی حکمت موجودات کو جاننا۔"

عربی لغت کی مبسوط اور مستند کتاب "لسان العرب" میں ہے کہ حکمت اچھی باتوں کا ان کی خوبی کی وجہ سے اختیار کرنا ہے۔

وَالْحِكْمَةُ عِبَارَةٌ عَنْ مَعْرِفَةِ اَفْضَلِ الْاَشْيَاءِ بِاَفْضَلِ الْعُلُوْمِ۔ "اور حکمت" بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعے جاننے سے عبارت ہے۔"

امام ابن جریر طبری نے مختلف اقوال لکھنے کے بعد حسبِ ذیل اپنا

فیصلہ درج فرمایا ہے:

وَالصَّوَابُ مِنَ الْقَوْلِ عِنْدَنَا فِی الْحِکْمَۃِ اَنَّھَا الْعِلْمُ بِاَحْکَامِ اللّٰہِ تَعَالٰی لَا یُدْرَکُ عِلْمُھَا اِلَّا بِبَیَانِ الرَّسُوْلِ صلعم وَالْمَعْرِفَۃُ بِھَا وَمَا دَلَّ عَلٰی ذٰلِکَ مِنْ نَظَائِرِہٖ وَھُوَ عِنْدِیْ مَاْخُوْذٌ مِنَ الْحُکْمِ الَّذِیْ بِمَعْنَی الْفَصْلِ بَیْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ۔

"ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکامِ الٰہی کے علم کا نام ہے جو رسولؐ کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کی اور جو اُن کی مثالیں اور نظیریں ہیں، ان کی معرفت کو حکمت کہتے ہیں۔ اور لفظِ حکمت میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے، جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔"

امام شافعیؒ اپنی تصنیف "کتاب الرسالہ" میں لکھتے ہیں:

وَسَمِعْتُ مَنْ اَرْضٰی مِنْ اَھْلِ الْعِلْمِ بِالْقُرْآنِ یَقُوْلُ اَلْحِکْمَۃُ سُنَّۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ۔

"میں نے قرآن کے اُن اہلِ علم سے جن کو پسند کرتا ہوں، یہ سُنا کہ حکمت آنحضرت صلعم کی سُنّت کا نام ہے۔"

امام شافعیؒ اسی کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل فرماتے ہیں:

وَالسُّنَّۃُ اَلْحِکْمَۃُ الَّتِیْ اُلْقِیَ فِیْ رَوْعِہٖ عَنِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ۔

"اور آپؐ کی سُنّت وہ حکمت ہے جو آپ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔"

اور یہ تو اِس بنا پر صحیح ہے کہ خود قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو

خطاب ہے:

ذَالِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۔ "یہ وہ ہے جو حکمت کی باتوں میں سے خدا نے آپ پر وحی کی ہے۔"

ائمۂ لغت اور علماء قرآن کے اگر تمام اقوال پر نظرِ غائر ڈالی جائے تو یقینی طور پر معلوم ہوگا کہ یہ سب کے سب ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں کر رہے ہیں، اور ایک ہی حقیقت کی یہ سب متعدد تفسیریں ہیں۔

حکمت، عقل و فہم کی اُس کامل ترین حقیقت کا نام ہے، جس سے صحیح و غلط، صواب و خطا، حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان فیصلہ، بذریعہ غور و فکر، دلیل و بُرہان، تجربہ و استقراء، بلکہ منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحبِ حکمت کا عمل بھی ہوتا ہے۔

دوسری ربّانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں نہیں ملتا۔ بلکہ حسبِ استعداد معمولی حکمت سے لے کر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک عطا ہوتی ہے۔ اس کے مختلف درجے اور مراتب عام انسانوں کو مل سکتے ہیں، اور ملتے ہیں، لیکن اس کا اعلےٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ صرف انبیاء علیہم السلام کو ملتا ہے۔

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح حکمت کا، اُس رُبانی عطیۂ آسمانی فہم، دینی عقل اور نورانی قوت پر اطلاق ہوتا ہے، اسی طرح اس قوت حکمت کے آثار و نتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

بہرحال یہ حکمت کی قوت انبیاء علیہم السلام کو بدرجۂ اتم حاصل تھی اور اسی

کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر بات دانائی اور ان کا ہر کام دانشمندی پر مبنی تھا اور یہ قوت ان کو حاصل تھی تو اس قوت کے آثار و نتائج یہی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے اور ان نبوی حکیمانہ آثار و نتائج کا اقرار و اعتراف اور ان پر عمل بھی نبوّت کی تصدیق کے اندر داخل ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال جن کے اصطلاحی نام احادیث و سنن ہیں۔ کتابِ الٰہی کی عملی و زبانی تشریحات ہیں۔ کتابِ الٰہی وحیِ ربّانی کا نتیجہ ہے اور احادیث و سننِ نبوی، سینۂ نبوی کی ملہمانہ حکمت کا۔ اسی لیے امام شافعیؒ کے رسالہ میں ارشاد ہے:

وَسُنَّتہٗ الْحِکْمَۃُ الَّتِیْ اُلْقِیَ فِیْ رَوْعِہٖ "اور آپ کی سُنّت وہ حکمت ہے جو آپ کے قلب میں ڈالی گئی"۔

اور اسی مفہوم کو مجاہدؒ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اَلْحِکْمَۃُ فَہْمُ الْقُرْاٰنِ "حکمت فہمِ قرآن کا نام ہے"۔ دوسری عبارت میں یوں کہو کہ "قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح حکمت" ہے اور اس تشریح کا نام جو رسولؐ کی دست و زبان سے اُدا ہوئی سُنّت ہے۔ اور اسی معنی کو امامِ مالکؒ اور ابن زیدؒ اور ابو رزینؒ وغیرہ دوسری صدی کے علماءِ قرآن اِن عبارتوں میں اُدا کرتے ہیں۔ کہ حکمت معرفتِ دین اور تفقہ فی الدین، اسی دینی علم کو کہتے ہیں، جو اللہ تعالےٰ کسی قلب میں پیدا کر کے اس کو منور کر دیتا ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اصل حکمتِ نبوی وہ نورِ نبوّت اور الہامی معرفت ہے جو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و سینہ میں ودیعت رکھا تھا اور چونکہ آپ کے سنن و اقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمتِ نبوی کے

پیداوار اور آثار و نتائج ہیں۔ اس لیے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے۔ اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے اور دونوں حق پر ہیں۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ جو احکام قرآن سے زائد احادیث و سنن ہیں وہ "اجتہادِ نبوی" ہیں۔ علماءِ اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرت صلعم کے سامنے پیش آتا اور وحی نازل نہ ہوتی تو آنحضرت صلعم اجتہاد فرماتے۔ یعنی گزشتہ وحی شدہ احکام کے تطابق سے آپ حکم دے دیتے تھے۔ (یہ فقہاء کا طریقۂ تعبیر ہے، ورنہ یوں کہنا چاہیئے کہ رسولؐ اپنی اس حکمتِ ربّانی کے فیض سے مدد لے کر جو خدا نے آپ کے سینہ میں ودیعت رکھی ہے، گزشتہ وحی کی کلّیات کی روشنی میں اس کا فیصلہ فرماتے تھے۔)

بہر حال خواہ فقہا کے طریق پر اجتہادِ نبوی کو نصوصِ قرآنی سے مستنبط سمجھیے۔ یا شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے نظریے کے مطابق رسول کے علم سینہ اور وحی شدہ اصولِ کلّی کی جزئیات تسلیم کیجیے۔ ہر حال میں وہ نتیجہ امت کے لیے واجب العمل اور خطا سے پاک ہے، کیونکہ یہ مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ انبیاءؑ گناہوں سے معصوم، ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوائے نفسانی سے مبرّا ہوتے ہیں۔ اس لیے اُمورِ رسالت اور اُمورِ دین میں اُن کی کوئی راہ غلط نہیں ہو سکتی، کہ اُن کی غلطی سے پوری اُمت کا غلطی پر قائم ہو جانا مسلّم ہے، حالانکہ ان کی بعثت کی غرض ہدایت ہے، ضلالت نہیں۔

شاہ صاحبؒ کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغِ رسالت، اور مہماتِ اُمورِ دین

سے ہے، دوسری وہ جن میں رسولؐ کے ارشادات کی حیثیت عام انسانی باتوں کی ہے، پہلی قسم وحی اور تعلیمِ ربّانی سے ہے جو دائمی اور ناقابلِ تغیّر ہیں۔

اِن ناقابلِ تغیّر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتیں ہیں:

"براہِ راست وحیِ الٰہی" جو وقتاً فوقتاً پیغمبرؐ کی تعلیم و اطلاع کے لیے خُدا کی طرف سے آیا کرتی تھی۔ اور دوسری "اجتہادِ نبوی" شاہ صاحب نے اِس اجتہاد کی نسبت دو باتیں تحریر فرمائی ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ اجتہادِ نبوی کی صورت درحقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے۔ مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ حق تعالےٰ نے اُن کو اجمالی طور سے شریعت کے کلّی اصول و قواعد کا علم، منصبِ نبوت کے ساتھ ساتھ عطا فرمایا ہے۔ اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح، احکامِ منصوصہ کی تفصیل، کسی کلیہ کے جزئیات، مسائل کی تشریح اپنے الفاظ میں فرمادیا کرتے تھے۔

(۲) پیغمبروں کا یہ اجتہاد، دوسرے عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطاء و غلطی سے یکسر پاک و منزّہ ہوتا ہے، کیونکہ ان کی رائے خطاء و غلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے۔ اِسی لیے ان کا اجتہاد بھی بمنزلہ وحی کے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبری اجتہاد سے مُراد و مقصود قوّتِ علمیہ یا الہامیہ یا نبوّتیہ ہے کہ جس کو اللہ تعالےٰ نے خاص انبیاءؑ کے سینوں میں ودیعت رکھا ہے، اسلئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے معنیٰ کی نہیں، اور کسی امام اور حاکمِ وقت اور نبی کے اجتہاد میں نسبت حق و باطل کی ہے اور وہی نسبت

ہے جو عصائے موسوی اور جادوگروں کے عصا میں تھی۔

اِنھیں وجوہ سے نبی کریمؐ کا اجتہاد اگر کبھی ایسے نتیجے پر پہنچ گیا جو مصلحتِ الٰہی کے مطابق نہ تھا، تو ہمیشہ اللہ تعالےٰ نے اُس پر متنبہ فرما کر آپؐ کو اپنی مرضی سے مطّلع فرما دیا ہے۔ الغرض بعض امور میں خبر کے کسی خاص پہلو سے تغافل ہونے یا غیب و مستقبل سے عدمِ واقفیت کے سبب نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہے۔ مگر اس خطأ پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہاد جس پر وحیِ الٰہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی، یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ وہ حکم و علمِ الٰہی کے منشاء کے مطابق اور خطاء و غلطی سے مبّرا ہے اور اس کے دوسرے معنیٰ وحیِ خفی یا باطنی وحی کے ہیں۔

خلاصۂ بحث اور حاصلِ کلام یہ ہے کہ نبی کریمؐ کے وہ ارشادات جن کا رسالت سے تعلق ہے اور وہ اقوال و افعال اور وہ احادیث جو دین سے متعلق ہیں اور جملہ احکام واجب الاتباع اور ضروری العمل ہیں۔ خواہ یہ نظریّہ لیجئے کہ نبی کی پیروی اور اتّباع و اطاعت قرآن میں مامور بہ ہے۔ اس لیے اقوال و افعالِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتّباع عین قرآن کی اتّباع ہے، ورنہ سینکڑوں آیات کا خلاف اور بیسیوں آیات کی تحریف و انکار ہوگا۔

یا یہ نظریّہ لیجئے کہ احادیث اجتہادِ نبی ہیں۔ لیکن پیغمبرانہ اجتہاد وہ رائے علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے بہتی ہیں، جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں، بلکہ الہامِ الٰہی، اِلقاءِ ربّانی، حکمتِ یزداں، فہمِ رسالت، ملکۂ نبوّت سے ماخوذ ہیں جو ضمنی اور ثانوی وحی ہیں۔

جس کی نسبت محرمِ اسرارِ شریعت عمر فاروق رضؓ برسرِ منبر فرماتے ہیں :

یَاأَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ الرَّاٴیَ اِنَّمَا	(اے لوگو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی
کَانَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلعم	رائے غلطی سے پاک تھی، کیونکہ اللہ تعٰ
مُصِیْبًا لِاَنَّ اللّٰہَ کَانَ یُرِیْهِ وَاِنَّمَا	آپ کو وہ رائے دکھاتا تھا، اور ہماری
هُوَ مِنَّا الظَّنُّ وَالتَّکَلُّفُ (ابوداؤد)	رائے، ہمارا گمان اور از خود کہنا ہے)

وہ رائے نبوی جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ بمنزلہ وحی کے ہے۔ اور اس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی رائے نہیں، بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے جو عملاً وحیِ الٰہی کے ہم پلہ و ہم مرتبہ اور کلامِ ربانی کے ہم پایہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے اِس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے درحقیقت وہ خود کلامِ پاک سے مستنبط ہے۔

یا یہ نظریہ لیجیے کہ احادیث قرآن کا بیان ہیں۔ "کتابُ اللہ" کی حیثیت کلی قانون کی ہے اور احادیث کی حیثیت کلی قانون کی نہیں، بلکہ اس قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں جو دراصل اس قانون کے اندر مندرج تھیں۔ مگر چونکہ عام لوگوں کے فہم میں نہیں آتی تھیں یا عام لوگ اِسکو نہیں سمجھتے تھے۔ اِس لیے صحابہؓ کے دریافت کرنے پر یا خود حضور صلعم نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر، اس کو کھول کر بیان فرما دیا کہ اشتباہ نہ رہ جائے۔

بات یہ ہے کہ دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں۔ یہ مخصوص صفات اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں۔ اُنہی کو ہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں۔ پھل، پھول،

چوپائے، پرندے، انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں۔ اور انہی خصوصیات کی بنا پر ہر نوع دوسرے سے ممتاز اور ہر صنف دوسرے سے علیحدہ ہے۔ گلاب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوشبو، خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ ہوں۔ لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں، جن سے گلاب کی ہر صنف دوسری صنف سے علانیہ الگ نظر آتی ہے۔

اِسی طرح نوعِ انسانی کے کچھ خاص لوازم ہیں۔ دو ہاتھ، دو پاؤں، سیدھا قد، ناک، کان، قوتِ ناطقہ، سمجھ بوجھ اور غور وفکر کی اہلیت، ایجاد و اختراع کی قوت، انجام بینی، مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں۔ لیکن اس وصفِ انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کی اصناف کی طرح نوعِ انسانی کی بھی مختلف اصناف ہیں۔ جیسے ہندی، چینی، حبشی، رومی، ایشیائی، یورپی، دیکھو اِن میں سے ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود، قد و قامت، چہرہ مُہرہ، رنگ و روغن، صورت شکل، اخلاق و عادت وغیرہ بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے۔ اور یہ تمام اصنافِ انسانی جو مختلف آب وہوا، مختلف زمان و مکان، مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں، انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہیں۔

اِسی طرح ہر صنفِ انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں۔ خلّاقِ فطرت نے اِن میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں۔ شاعری، زبان دانی، فلسفہ، ریاضی،

صناعی، باغبانی، معماری، پہلوانی اور سینکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعدادیں اور قابلیتیں ہیں۔ ان میں سے ہر صنف کی اور ہر صنف میں سے ہر ایک فرد کی قابلیت و استعداد کی خصوصیتیں دوسروں سے الگ ہیں۔ ایک تخیل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی داں میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے۔ آداب وانشا کے خیال، بلند پروازی، عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں اور واقعیات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے ادب و شاعری سے بیگانہ، پہلوانی کے جوہر اور باغبانی سے الگ ہیں۔ ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ صنفِ شعراء میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے، نظم کی قوت، تخیل کی بلندی، محاکات کی قدرت، الفاظ کا زور، معانی کا تعمق یہ تمام شعراء کی مخصوص صفات ہیں۔

اِن مثالوں سے یہ ثابت ہے کہ نوعِ انسانی میں اشتراک ہونے کے باوجود اصنافِ انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم و صنف کی الگ الگ خصوصیات، صفات اور لوازم ہیں۔

انہی مختلف اصنافِ انسانی میں انبیاء علیہم السّلام کی بھی ایک صنف ہے اور نوعِ انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی چند خاص اوصاف، خصوصیات اور لوازم ہیں جو اُن کو دوسرے اصنافِ انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں۔

نبوت و رسالت کا امتیاز صرف یہی نہیں ہے کہ وہ خدا کا پیغام بندوں کو پہنچا دے۔ جیسا کہ آج کل اسلام کے لیے محسنوں کی تحریرات سے آشکارا و ظاہر

ہوتا ہے، بلکہ نبوّت و رسالت کے خواص بے شمار ہیں اور کتب فن میں اپنے اپنے مقام پر مکتوب و مسطور ہیں۔ پھر خصوصیت سے جناب نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ جملہ انبیاء ؑ میں افضل الرسل اور خاتم المرسلین ہیں، حضورؐ کے خواص تو لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی ہیں ؎

فَمَبْلَغُ الْعِلْمِ فِیْہِ اَنَّہٗ بَشَرٌ
وَاَنَّہٗ خَیْرُ خَلْقِ اللّٰہِ کُلِّہِمٖ

منجملہ ان بے شمار خواص کے سب سے پہلی چیز" وہبی استعداد" ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں ہیں اور ان ہی کی طرف اس کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی استعداد اور میلانِ طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدّت میں جاکر وہ پوری طرح ظاہر ہوجاتا ہے۔ جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہوسکتا، بلکہ اسی سے ہوگا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے۔ پھر آم کے درخت کے آثار، خواص اور پھل، اس کا مزہ، اس کا رنگ و بُو، غرض جملہ خصوصیات خود درخت میں اسی وقت موجود ہوتی ہیں جب وہ ہنوز تخم ہی کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہی تخم پودا بنتا ہے، پودا پیڑ بنتا ہے، کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے۔ لیکن اپنی ترقی کے ہر دَور میں وہ اپنی مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن اُس سے آخر میں ظاہر ہونے والی ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ بالقوۃ اس میں موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہوسکتا۔

بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب سے عرصۂ وجود میں قدم رکھتے ہیں، اسی زمانے سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار اُن سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ وہ حسب و نسب اور سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں۔ شرک و کفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں۔ اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اُن کی ذہانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلّم ہوتی ہے۔

نبوّت کا دوسرا سب سے اہم خاصّہ اس کا غیبی علم ہے، یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجدان، احساس یا عقل و قیاس سے نہیں بلکہ براہِ راست صدائے غیب یا رویائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے، اسی کے آغاز سے نبوّت کی استعداد بالقوۃ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ علمِ انسانی کی دو[۲] قسمیں ہیں۔ ایک[۱] وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے۔ دوسرے[۲] وہ جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے۔ بلا واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں۔ "وجدان[۱]" جیسے بھوک، پیاس، بیماری، صحت، غم اور خوشی وغیرہ۔ "فطرت[۲]" یا جبلّت۔ پرندوں کے بچّوں کا دانہ چگنا، اُڑنا، آبی جانوروں کا تیرنا، شیر کے بچوں کی درندگی، انسان کے بچہ کا پیدا ہوتے ہی رونا، سونا، دودھ پینا، یہ فطری علوم بلا تعلیم سب کو حاصل ہیں۔ "بداہتِ اوّلیہ" انسان کو کچھ ہوش و تمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا بہ ادنیٰ تامّل اِس

طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں کسی قسم کے شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی، جیسے دُو
اور دُو چار ہوتے ہیں۔ یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں ہوئیں۔ اس کے بعد علمِ انسانی
کی دو قسمیں ہیں۔ جن کا علم اُس کو کسی واسطے سے ہوتا ہے۔ اِس قسم کے دُو واسطے
ہیں۔ ایک احساس اور دوسرا عقل۔

پہلے سے گرد و پیش کی مادّی چیزوں کا علم۔ انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم
کی جسمانی قوتیں ہیں، جن کو حواسِ خمسہ کہتے ہیں۔ انسان کے پاس یہی پانچ آلات
ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ان مادّی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے، جو اس کے
اِن آلات سے آکر ٹکراتی ہیں۔ اِسی کا نام احساس ہے۔

علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس، غور و فکر
اور استدلال کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ ان کی بنیاد درحقیقت اُنہی معلومات
پر ہوتی ہے جن کا علم ہم کو اپنے وجدان، فطرت، بداہت اوّلیہ اور احساس
سے پہلے ہو چکا ہے۔ اور اِنہی معلوم شدہ اُمور پر غیر معلوم اُمور کو تمثیل یا استقراء
کے ذریعہ قیاس کر کے ان معلوم شدہ اُمور کے خصوصیات اور آثار کا حکم
ان غیر معلوم، لیکن مشابہ و مماثل پر لگا کر نتیجہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ غیر معلوم اَمر
جس پر معلوم اَمر کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں اگر مادّی ہوتا ہے تو نتیجہ
چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا۔ اس کے سوا کہ جزئیات کا استقراء پورا نہ کیا
گیا ہو۔ یا تمثیل تام نہ ہو، یا تجربہ و مشاہدہ نے دھوکا دیا ہو، لیکن اگر وہ مجہول
امر غیر مادّی ہے تو مادّی اُمور پر اس غیر مادّی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا
جائے گا اس کا مرتبہ ظنّ و تخمین سے آگے نہیں بڑھتا۔

پس سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے وجدانیّات اور فطریّات ہیں۔ جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقاء اِس علم پر موقوف ہے۔

وجدانیّات و فطریّات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے۔ محسوسات کے بعد بدیہیّات اولیہ کا درجہ آتا ہے۔

سب سے اخیر میں اس علم کا درجہ آتا ہے جو وجدانیّات، فطریّات، بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور جن کو معقولات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اِسی علم اور اسی قوّت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقول درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں۔ ایک جانب (کمی کی سمت میں) وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہے اور دوسری جانب (سمتِ کمال میں) عاقل، عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آجاتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جہاں اس کا کوئی دوسرا حریف اور ہم سَر نہیں ہوتا۔ ایک جاہل حبشی سے لے کر ارسطو اور بوعلی سینا تک سب اسی عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں۔

عام طور سے انسانی عِلم کے یہ پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے جس کا تعلق تمامتر ماوراء مادّہ سے ہے۔ اس کا تعلق مادّہ سے اِتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیّات کا ہے۔ وہ تمامتر مادّہ اور مادّیات سے پاک ہوتا ہے۔ اس کو مادّہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادّی دل و دماغ کے آئینہ پر اُوپر سے آکر اپنا عکس

ڈالتا ہے۔

اِس غیر مادی علم کے بھی بالترتیب مختلف درجے ہیں۔ جن کو فراست، ادراک، الہام، کشف اور وحی کہتے ہیں، اور جس طرح انسانی علم کے مذکورۂ بالا چاروں ذریعے انسان کے جسمانی قویٰ سے متعلق تھے۔ اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کی روحانی قویٰ سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح وجدان سے لیکر عقلیات تک بالترتیب ہمارا ذریعۂ علم خالص مادی، کامل مادی، کم مادی اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے۔

اِسی طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادی و روحانی سے لے کر پھر روحانی، کامل روحانی اور خالص روحانی کے ذریعہ تک ترقی کرتا چلا گیا ہے۔

وحی کے لغوی معنیٰ کسی کا اپنا دلی منشاء لبوں کو جنبش دیئے بغیر اِخفاء اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا۔ اور اصطلاحاً خدا کا اپنے دلی منشاء سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطّلع کرنا، وحی علم و اطّلاع کے ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔ جس طرح علم کی تین قسمیں یعنی وجدانیات، حسیّات، بدیہیات عام انسانوں کے لیے یقینی ہیں، اِسی طرح روحانی علم کے تینوں ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السّلام کے لیے یقینی ہیں۔ اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے، یعنی وجدان پھر حسِّ ظاہر اور پھر بدیہیات۔ اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ

ہے جو تمام تر روحانی ہے، یعنی وحیؔ پھر الہامؔ پھر کشفؔ ۔

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں بیان کی ہیں۔ وحیؔ، الہامؔ اور کشفؔ، یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں۔ قرآن پاک میں رُوحانی ذریعۂ علم کا نام "مکالمۂ الٰہی" (خدا سے بات کرنا ہے) اور اس کی حسبِ ذیل تین قسمیں ہیں۔

۱۔ وحیؔ (اشارہ) سے بات کرنا۔ یعنی دل میں کسی معنیٰ کا بغیر الفاظ اور آواز کے آجانا، یہ اگر حالتِ بیداری میں ہے تو کشف ہے اور اگر خواب میں ہے تو رؤیا ہے۔

۲۔ خُدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا۔ یعنی متکلّم نظر نہیں آتا، مگر غیب سے آواز آتی ہے اور الفاظ سُنائی دیتے ہیں، یہ الہامؔ ہے۔

۳۔ فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا۔ یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے مُنہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں، جن کو نبی سُنکر محفوظ کر لیتا ہے۔ اِسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں، کیونکہ قرآن پاک کا نزُول اِسی آخری طریقہ سے ہوا ہے۔ لیکن اِس شہرتِ عام کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ دوسرے دو۲ طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں۔

موجودہ زمانہ میں ہمارے نئے محسنوں کو ایک غلطی یہ بھی ہو رہی ہے کہ وہ محض قرآن کو قابلِ اتباع سمجھتے ہیں، حالانکہ "مکالمۂ الٰہی" کے یہ تینوں طریقے خود قرآن کی سورۂ شوریٰ میں مذکور ہیں۔

اِن تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے، یعنی یہ مقسم بھی ہے اور اپنی

تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے یعنی قسم بھی۔

الغرض اس امتیاز کے لیے علمی اصطلاحات میں ان تینوں طریقوں کے لیے کشف، الہام اور وحی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیے گئے، تاکہ بول چال میں ہر رُوحانی طریقہ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے۔

بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے اور خواب کے عالم میں رؤیا ہے۔ پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے اور فرشتہ کی وساطت سے بات کرنا وحی ہے۔ یہ پوری بحث التقریر والتحبیر شرح تحریر لابن الهمام اور اصولِ نقد کی اہم کتابوں میں ہے۔

بہر حال غیبی ذریعۂ اطلاع کی یہ سب سے بلند اور اکمل ترین قسم جسکو اصطلاح میں وحی کہتے ہیں، انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ مخصوص ہے اور بقیہ اقسام کا کچھ حصّہ غیرِ انبیاء کو بھی نصیب و میسّر ہو سکتا ہے۔

اور انبیاء علیہم السّلام کو اپنے کشف، الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات، محسوسات، نظریات اور بدیہیات پر۔ انبیاء کا یہ روحانی علم ایسا اندرونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجدانیات، نظریات اور بدیہیات ومحسوسات کا علم ہوتا ہے۔ جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے یا اس کو غم یا خوشی ہے، اِسی طرح نبی کو بھی اپنی روحانی وجدانیات میں دھوکا نہیں ہوتا۔ غرض انبیاء ؑ اپنے ان جملہ غیبی و روحانی ذرائعِ علم میں، ہر لغزش، فریب، خطا اور

غلطی سے اِسی طرح پاک ہوتے ہیں، جس طرح ہم اپنے وجدانیات، نظریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطاء سے پاک ہوتے ہیں۔

حکمائے اسلام نے وحی کی حقیقت ملکۂ نبوّت سے ظاہر کی ہے۔ تشریح اُس کی یہ ہے کہ ترتیبِ کائنات پر غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں علم اور تعقّل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقّی کی ہے۔ جمادات بے حس ہیں، اس کے اوپر نباتات ہیں، جن میں صرف محدود احساس ہوتا ہے اور دماغی قویٰ حافظہ تذکرا ور غور و فکر کی قوّت سے محروم ہوتے ہیں۔ اِن سے اُونچے حیوانات ہیں، جن میں یہ تمام قُویٰ ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں، اور آخر میں ان سے بالاتر ہستی یعنی انسان میں جاکر یہ قوُیٰ پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں، ان قُویٰ کی ترقّی یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ نباتات میں جس طرح قوّتِ احساس ہے، جس سے جمادات محروم ہیں، اور حیوانات میں حافظہ، تصوّر اور تعقّل کی اس درجہ قوّتیں نہیں، انسان میں وہ دماغی، ذہنی قوُیٰ ہیں جو حیوانات میں نہیں، اِسی طرح انبیاء ؑ میں علم و تعقّل کی ایسی قوّت موجود ہوتی ہے، جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی اور اسی کا نام ملکۂ نبوّت ہے۔

حواس صرف مادیّات کو دریافت کرتے ہیں، دماغی قُویٰ مادیّات سے بلند ذہنیّات اور عقلیّات کو اور ملکۂ نبوّت اس سے بھی اُونچا جاتا ہے۔ وہ ذہنیّات و عقلیّات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیّات کو دریافت کرتا ہے۔ اِس ذریعۂ علم میں غور و بحث اور منطقیانہ فکر و نظر اور ترتیبِ مقدّمات کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیّات، نظریّات، بدیہیّات

اور محسوسات سامنے آتے ہیں اور انہیں کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں اور چونکہ اس ذریعہ میں علمِ انسانی کے عام ذریعہ اور طریقہ سے معلومات حاصل نہیں کی جاتیں، بلکہ خود علاّمُ الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر اُن کو عطا کرتا ہے، شرع کی زبان میں اسی کو وحیؔ والہامؔ کہتے ہیں۔ علمِ کلام کی اصطلاح میں مَلکۂ نبوّت اور عام محاورے میں اُس کو غیبی علم کہہ لیجئے۔

لیکن اہلِ نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہِ راست فرشتوں کے ذریعہ مطّلع کرتا رہتا ہے، یہی وحیؔ ہے۔

امعان نظر سے معلوم ہوگا کہ اصولِ عقل ونقل کے اختلاف کا منشاء یہ ہے کہ آیا یہ وحیؔ خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہبی علم وفہم کا نتیجہ ہوتا ہے یا خود براہِ راست وقتاً فوقتاً تعلیمِ ربانی کا؟ دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم و فہم کی قوّتِ آغازِ پیدائش ہی میں فطرۃً ودیعت کر دی جاتی ہے۔ اِسی طرح انبیاءؑ میں منشاء الٰہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں فطرۃً ودیعت کر دی جاتی ہے۔ یا یہ کہ وہ فطرۃً تو ویسے ہی عام انسانوں میں علم وفہم رکھتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نبوّت کے بعد ان کو اپنے منشا سے کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتّحاد میں ہے۔ وہ لوگ جو عقل ونقل دونوں کے جامع ہیں اور وہ اِن دونوں کو مجتمع کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

یارِ ما ایں دارد وآن نیز ہم!

انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم سے بدءِ فطرت اور آغازِ پیدائش سے اُن امور کے متعلق جن کا ان کی نبوّت ورسالت سے تعلّق ہے اور جس کو دین کہتے ہیں وہ کلّی استعداد اور عمومی فہم عطا کرتا ہے، جس سے غیر انبیاء محروم ہوتے ہیں اور اس پوشیدہ قوّت کا عملی ظہور اُس وقت سے ہوتا ہے جب وہ نبوّت کے منصب پر عملاً سرفراز ہوتے ہیں۔ اِسی کا نام ملکۂ نبوّت ہے اور اہم امورِ دین کے متعلق اُن کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاعات ملتی رہتی ہیں، اُن کا نام وحی ہے۔

آجکل قرآن فہمی اور عقل کے مدّعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ دراصل اِنھیں دو قوّتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے، عقل کے مدّعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بے شک براہِ راست خدا کی وحی ہے مگر اس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اُس کی پیغمبرانہ نہیں بلکہ انسانی وبشری علم وفہم کا نتیجہ ہے، اِس لیے اُس کی تشریعی حیثیت نہیں، بلکہ اُس کی پابندی عام مسلمانوں پر بحیثیت امامت تھی، یہ خیال وعقیدہ حقیقتِ نبوّت سے ناواقفی اور خواص ولوازمِ نبوّت کا انکار ہے، بلکہ انکارِ نبوّت ورسالت کے مترادف ہے۔ کسی شئے کا اور اس کے لوازم کا انکار دراصل اصل شئے کا انکار ہے۔ جیسے آفتاب کا اقرار ہو، لیکن دھوپ سے انکار، یا دن کا اقرار ہو لیکن روشنی سے انکار۔ رات کا اقرار ہو لیکن اس کی تاریکی وظلمت سے انحراف۔ یہ سب اقرار بمنزلہ عدمِ اقرار بلکہ انکار وتکذیب کے مترادف ہیں۔ لہٰذا منصبِ رسالت کی یہ تصدیق نہیں بلکہ تحریفِ رسالت اور مضحکۂ رسالت

ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحیِ قرآنی جیسی وحی ہے۔ اسی طرح نبی کے دوسرے احکام، اقوال و افعال، عام بشری علم و فہم کا نتیجہ نہیں بلکہ اُکی پیغمبرانہ ذہنی قوت اور غیبی علم و فہم کے نتائج ہیں۔ جو وحی کی دوسری قسم اس لیے ہے کہ اس کا منشاء ملکۂ نبوت کے ذریعہ وحیِ ربانی کی ترجمانی ہے۔ اِس لیے پیغمبرؐ کی وحی اور ملکۂ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ نبی میں علم و فہم کے تین ذریعے ہیں۔ وحی، ملکۂ نبوت، اور عقلِ بشری۔ ان میں سے اول و آخر کے ثبوت میں کسی استدلال کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ یہ مسلّمات میں سے ہیں، صرف ملکۂ نبوت محلِ کلام رہ گیا۔

اِس سلسلے میں یہ کہنا ہے کہ جن علماء اور محققین نے اس کی حقیقت ظاہر فرمائی ہے۔ انہوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اُس کی الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں، مگر مفہوم و معنیٰ کے لحاظ سے دراصل وہ ایک ہیں۔ سلف صالحین میں سے بعض نے اُس کو "القاء فی الروع" (دل میں ڈالنا) نبی کی حکمتِ قلبیہ، توفیقِ ازلی اور قوتِ تمیین سے تعبیر کیا ہے جیساکہ امام شافعیؒ نے کتاب الرسالہ میں ذکر فرمایا ہے۔ امام غزالیؒ، امام رازیؒ اور دیگر متکلمین نے اِس کو "ملکۂ نبوت" سے اَدا کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس کو "پیغمبرانہ قوتِ اجتہاد" سے نامزد کیا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو "علمِ لدُنی" کہا جاتا ہے۔

مگر اِن سب کے معنیٰ تقریباً ایک ہی ہیں، یعنی پیغمبر کے اندر وہ پیغمبرانہ عقلی قوت جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ وہ وحی کی تشریح اسرارِ

شریعت کا بیان اور دقائقِ حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیاءِ کرام علیہم الصّلوٰۃ والسّلام کے اُن ربّانی انعامات کی فہرست پڑھیے، جن کا تذکرہ قرآنِ پاک نے جا بجا کیا ہے۔ تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد سرِ فہرست جو چیز نظر آئے گی وہ "علمِ نبوّت" ہے۔

جس کو کہیں "ذکر" یادداشت، کہیں "حُکم" حق و باطل میں تمیز کا مَلکہ، کہیں "حکمت" دانائی، کہیں "شرحِ صدر" سینہ کا کھول دینا، کہیں "تفہیم" سمجھ بُوجھ دینا، کہیں "تعلیم" سکھا دینا، کہیں "ارامت" دکھا دینا، سُوجھا دینا کہا گیا ہے۔ اِن سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقلِ بشری [illegible] عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے۔ اِس سے مُراد وحی تو اِس لیے نہیں کہ اُن کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے، اور عقلِ بشری اِس لیے نہیں کہ عقلِ بشری [illegible] کوئی انعام نہیں، کہ یہ نعمت ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے۔ اِس بنا پر اس سے مُراد عقلِ نبوی اور حکمتِ نبوی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور اِسی کو کافۃ النّاس اور جمہور مسلمان سنّت کہتے ہیں۔

پس حکمتِ نبوی وہ نورِ نبوّت اور الہامی معرفت ہے جو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ منوّرہ میں ودیعت رکھا تھا اور چونکہ آپؐ کے سنن و اقوال آپؐ کی اِس ودیعت شدہ حکمت کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں، اِس لیے واجب الاقتدا اور اتباع ہیں اور اقرارِ رسالت کا عین مُقتضا۔

صحابۂ کرام رضؓ

جو پاک ہستیاں عہدِ رسالتؐ میں تھیں، ان میں سے بہت سے بزرگ ایسے

تھے جنھوں نے مدتوں جناب رسول اللہ صلعم کی صحبت سے فیض اُٹھایا تھا، (خلفاء راشدین اور تمام اکابر صحابہ رضؓ) بہت سے بزرگ تھے جنھوں نے آپؐ کے ساتھ متعدد غزوات میں شرکت کی تھی۔ بہت سے بزرگ تھے جنھوں نے احادیث کی روائتیں کی تھیں، بہت سے بزرگ تھے جنھوں نے مسلمان ہوکر سن بلوغ میں آپ کو دیکھا تھا۔ بہت سے لوگ تھے جنھوں نے قبلِ اسلام آپؐ کو دیکھا تھا۔ لیکن بعد اسلام ان کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ بہت سے لوگ تھے جو عہدِ رسالت میں موجود تھے، لیکن اُن کو آپؐ سے ملنے یا آپؐ کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، بہت سے لوگ تھے جنھوں نے آپؐ کی زندگی میں آپؐ کو نہیں دیکھا، لیکن آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کا دیدار نصیب ہوا۔ اور اِنکے علاوہ بہت سے بچے تھے جو آپؐ کے مبارک عہد میں پیدا ہوئے، اور صحابۂ کرام رضؓ نے ان کو تبرکاً آپؐ کی خدمت میں حاضر کیا۔ آپؐ نے ان کا نام رکھا اور ان کو دُعا دی۔

اَب سوال یہ ہے کہ اِن مختلف الحیثیات بزرگوں میں کون لوگ ہیں، جن پر لفظ صحابی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے اور وہ صحابہ رسول اللہ کے مقدس خطاب سے یاد کیے جا سکتے ہیں؟

محدثین کی ایک جماعت اور جمہور اصولیین نے صحابی ہونے کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ اُس کو ایک مدت تک رسول اللہ صلعم کے ساتھ نشست و برخاست کا موقع ملا ہو۔

حضرت سعید بن المسیبؒ نے اِس شرط کے ساتھ یہ قید بھی لگائی ہے

کہ کم ازکم اُس کو رسول اللہ صلعم کے ساتھ دو ایک غزوات میں بھی شرکت کا موقع ملا ہو اور کم ازکم اُس نے ایک سال آپؐ کے ساتھ قیام کیا ہو۔

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ صحابی صرف اُس کو کہتے ہیں جس نے رسول اللہ صلعم سے احادیث کی روایت کی ہو۔

بعض لوگوں کے نزدیک صحابی ہونے کے لیے صرف طولِ صحبت کافی نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اُس نے آپؐ کیساتھ صحبت بغرض حصولِ علم و عمل اختیار کی ہے؟

بعض لوگ ہر اُس مسلمان کو صحابی کہتے ہیں جس نے حالتِ بلوغ اور حالتِ صحتِ عقل میں آپؐ کو دیکھا ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک آپ کا دیکھنا بھی ضروری نہیں، بلکہ ہر اُس مسلمان کو صحابی کہا جا سکتا ہے جو عہدِ رسالتؐ میں موجود تھا۔

محدّثین کی ایک جماعت جس میں امام بخاریؒ بھی شامل ہیں، صحابی کا خطاب صرف اُن لوگوں کو دیتی ہے، جنھوں نے رسول اللہ صلعم کو حالتِ اسلام میں دیکھا ہے، بلکہ آنکھوں سے دیکھنا بھی ضروری نہیں، صرف ملاقات ہی کافی ہے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن مکتومؓ اندھے تھے۔ آپؐ کو آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن بایں ہمہ اُن کا شمار صحابہؓ میں ہے، کیونکہ ان کو آپؐ کی ملاقات کا شرف حاصل تھا۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ ہر وہ شخص جس نے ایک مہینہ، یا ایک دن، یا ایک منٹ تک آپؐ کی صحبت اُٹھائی یا آپؐ کو دیکھا ہے، وہ صحابی ہے (اسد الغابہ جلد ۱)

البتہ جو لوگ آپؐ کے عہدِ مبارک میں پیدا ہوئے وہ صحابی نہیں، حافظ ابنِ حجر کا قول اصابہ میں ہے" ذکر اولئك فی الصحابۃ انما ھو علیٰ سبیل الالحاق لیکن بعض لوگوں کے نزدیک یہ لوگ بھی صحابہ کے گروہ میں داخل ہیں۔ مولانا عبدالحی ظفر الامانی میں لکھتے ہیں:

والمرجح ھو دخولہ فیھم لغم حدیثھم مرسل لکنہ مرسل مقبول۔

"مرجح یہ ہے کہ وہ صحابہ میں داخل ہیں، البتہ اِن کی حدیث مرسل ہے لیکن وہ مرسل مقبول ہے۔"

تعدادِ صحابہؓ

صحابہؓ کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان سے اُن کی تعداد کا صحیح پتہ لگانا سخت مشکل ہے اور اِس کو خود ان کتابوں کے مصنّفین تسلیم کرتے ہیں۔ علی بن زرعہ کا قول ہے کہ آپؐ کی وفات کے وقت جن لوگوں نے آپؐ کو دیکھا اور آپؐ سے حدیث سُنی، اُن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے، جن میں مرد و عورت دونوں شامل تھے اور اُن میں ہر ایک نے آپؐ سے روایت کی تھی۔

ابنِ فتحون نے ذیلِ استیعاب میں اِس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ابو زرعہ نے یہ تعداد صرف اُن لوگوں کی بتائی ہے جو رواتِ حدیث میں سے تھے لیکن ان کے علاوہ صحابہؓ کی جو تعداد ہو گی، وہ اس سے کہیں زیادہ ہو گی۔

بہرحال اکابر صحابہؓ کے نام، اُن کی تعداد، ان کے حالات صحیح طور پر ہم کو معلوم ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ہم صحابہؓ کی صحیح تعداد نہیں بتا سکتے۔ ایک اوسط تعداد جو اُن کی بیان کی جا سکتی ہے وہ ایک لاکھ کے قریب ہے۔

غزوات وغیرہ کی تعداد سے پتہ لگانا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اُن میں عموماً عورتیں داخل نہیں ہیں۔

عدالتِ صحابہؓ

اگرچہ اصول کا یہ مسئلہ ہے کہ "الصحابۃ کلھم عدول" یعنی تمام صحابہؓ عادل ہیں"۔ لیکن شافعیہ میں ابوالحسین القطان نے اس عموم سے اختلاف کیا ہے، کیونکہ اُن کے نزدیک صحابہ میں کچھ بزرگ ایسے ہوئے ہیں، جن سے لغزشیں ہوئی ہیں۔

خوارج کا خیال ہے کہ عام طور پر تمام صحابہ خانہ جنگی سے پہلے عادل تھے لیکن جب خود صحابہ میں خانہ جنگی پھیل گئی اور صفین و جمل کے معرکہائے کارزار گرم ہوئے، تو یہ لوگ عادل نہیں رہے۔

معتزلہ کے نزدیک جن لوگوں نے حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ کی، وہ عادل نہیں۔ جو لوگ امیر معاویہؓ کے طرف دار ہیں وہ اس کے برعکس دعوےٰ کرتے ہیں۔ محدث مازری نے اس اصول کو صرف ان صحابہ کے لیے مخصوص کیا ہے جو شب و روز رسول اللہ صلعم کی صحبت اور آپؐ کی اعانت میں مصروف رہتے تھے، ان کے نزدیک عام صحابہؓ اِس عموم میں داخل نہیں۔ (اصابہ)

لیکن عام محدثین کے نزدیک اُن آیات کی بنا پر جو قرآنِ پاک میں عموماً تمام صحابہؓ کے فضائل میں نازل ہوئی ہیں، یہ اصول تمام صحابہؓ پر ہر زمانہ میں حاوی ہے اور اس کے تحت میں صحابہ کا ہر فرد داخل ہے، لیکن عدالت کے معنیٰ کبھی

اجتناب عن الکذب کے آتے ہیں، اِس معنیٰ میں عادل اُس شخص کو کہیں گے جو دروغ بیانی نہ کرتا ہو۔ تمام صحابہؓ کو اسی معنیٰ میں عدول کہا جاتا ہے۔ یہ کسی عالم کا دعوائے نہیں ہے کہ صحابہ سے کوئی فعل تقویٰ و طہارت کے خلاف صادر نہیں ہو سکتا، یا وہ انبیاءؑ کی طرح معصوم ہیں، یا وہ تمام گناہوں اور خطاء اور لغزشوں سے محفوظ ہیں۔ چنانچہ محدثین نے صاف تصریح کی ہے۔ علامہ سخاوی فتح المغیث میں لکھتے ہیں:

قال ابن الانباری لیس المراد	ابن انباری کا قول ہے کہ عدالت کا یہ
بعد التھم ثبوت العصمۃ واستحالۃ	مطلب نہیں کہ صحابہؓ معصوم ہیں، اور
المعصیۃ منھم وانما	ان سے گناہوں کا سرزد ہونا محال ہے،
المراد قبول روایاتھم من غیر	مطلب یہ ہے کہ ان کی روایتوں کو
تکلف البحث عن	اسباب عدالت و ثقاہت کی چھان بین
اسباب العدالۃ و	کے بغیر قبول کر لینا چاہیئے۔ بجز اس
طلب التزکیۃ الا ان یثبت	صورت کے کہ وہ ایسے امر کا ارتکاب
ارتکاب قادح ولم	کریں، جو روایات میں قادح ہو اور
یثبت ذالک۔	یہ ثابت نہیں ہے۔

مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں:

"اہلِ سنّت کا یہ مقرر عقیدہ ہے کہ صحابہؓ کُل کے کُل عادل ہیں۔ یہ لفظ بار بار بولا گیا ہے اور میرے والد مرحوم (شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی) نے اس لفظ کی حقیقت سے بحث کی تو ثابت ہوا کہ

اس موقع پر عدالت کے متداول معنیٰ مُراد نہیں، بلکہ صرف عدالت فی روایۃ الحدیث مُراد ہے، اس کے سوا اور کچھ مُراد نہیں، اور اِس عدالت کی حقیقت روایات میں اجتناب عن الکذب ہے۔ کیونکہ ہم نے تمام صحابہؓ کی سیرت کو خوب ٹٹولا حتیٰ کہ ان لوگوں کی سیرت کا بھی تتبع کیا جو خانہ جنگیوں، فتنوں اور لڑائی جھگڑوں میں شریک ہوئے تو ہم کو معلوم ہوا کہ وہ رسول اللہ کے متعلق دروغ بیانی کو سخت ترین گناہ سمجھتے ہیں اور اس سے شدت کے ساتھ احتراز کرتے ہیں۔" (ظفر الامانی)

صحابہ اور اطاعتِ رسولؐ

صحابہ کرام جس طوع و رضا کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے تھے اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صرف حاکمانہ اور جابرانہ اطاعت نہ تھی، جو حاضر و غائب اور موت و حیات میں یکساں ہے۔ یقیناً یہ تشریعی اطاعت ہے جو تاقیامت قائم ہے اور رہے گی اور یہ ایک غیر متبدل اطاعت ہے، جس میں تاقیامت فرق نہیں آسکتا۔ اس کے متعلق احادیث میں نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں، ذیل کے چند واقعات سے ان کا اندازہ ہوسکے گا۔

آپؐ نے ایک صحابی کو رنگین چادر اوڑھے ہوئے دیکھا تو فرمایا۔" یہ کیا ہے؟" وہ سمجھ گئے کہ آپ نے ناپسند فرمایا، فوراً گھر میں آئے اور اس کو چولھے میں ڈال دیا۔ (ابنِ ماجہ)

حضرت خریم اسدی ایک صحابی تھے جو نیچا تہہ بند باندھتے تھے اور لمبے بال رکھتے تھے۔ ایک روز آپؐ نے فرمایا۔ "خریم اسدی کتنا اچھا آدمی تھا، اگر لمبے بال نہ رکھتا اور نیچا تہہ بند نہ پہنتا"۔ اُن کو معلوم ہوا تو فوراً قینچی منگائی، اُس سے بال کترے اور تہہ بند اونچا کرلیا۔ (ابوداؤد)

بیوی سب کو عزیز ہے، لیکن جب آپؐ نے تخلف غزوۂ تبوک کی بناء پر تمام مسلمانوں کو حضرت کعبؓ بن مالک سے قطع تعلق کا حکم دیا اور اخیر میں ان کو بیوی سے بھی علیحدگی اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی تو بولے کہ "طلاق دے دوں یا اور کچھ؟" لیکن آپؐ کے قاصد نے کہا، صرف علیحدگی مقصود ہے، چنانچہ انھوں نے فوراً بیوی کو میکہ بھیج دیا۔ (بخاری)

شادی بیاہ کا معاملہ نہایت نازک ہوتا ہے، لیکن صحابۂ کرام کو اطاعتِ رسولؐ نے اِن معاملات میں غور وفکر کرنے سے بے نیاز کر دیا تھا۔

حضرت ربیعہ اسلمی رضؓ ایک نہایت مُفلس صحابی تھے۔ ایک بار آپؐ نے اُن کو نکاح کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ جاؤ انصار کے فلاں قبیلے کی لڑکی سے نکاح کرلو۔ وہ آئے اور کہا کہ رسول اللہ نے مجھے تمھارے یہاں نکاح کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ سب نے اُن کا خیر مقدم کیا، اور کہا کہ رسول اللہؐ کا قاصد ناکام نہیں جا سکتا۔ چنانچہ فوراً انھوں نے اس کی تعمیل کی۔ (مسند ابنِ حنبل)

پابندیِ احکامِ رسولؐ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دیتے تھے، ان میں جو وقتی ہوتے

تھے صحابۂ کرام فوراً اُن کی تعمیل کرتے تھے۔ اور جو دائمی ہوتے تھے ہمیشہ اُن کے پابند رہتے تھے اور اس کے خلاف کبھی اُن سے کوئی حرکت سرزد نہیں ہوتی تھی۔

آپؐ کے زمانہ میں عورتیں بھی شریکِ جماعت ہوتی تھیں، اس حالت میں اقتضاءِ کمالِ عفت وعصمت یہ تھا کہ ان کے لیے مسجد کا ایک دروازہ مخصوص کر دیا جائے۔ اِس بناء پر آپؐ نے ایک روز ارشاد فرمایا کہ:

لو ترکنا هذا الباب للنساء۔ "کاش! ہم یہ دروازہ صرف عورتوں کے لیے چھوڑ دیتے۔"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس شدت کے ساتھ اس کی پابندی کی کہ تا دمِ مرگ اُس دروازے سے مسجد میں داخل نہیں ہوئے۔ (ابوُ داوٗد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا:

من زار قوماً فلا یؤمهم ولیؤمهم رجل منهم۔ "جو شخص کسی قوم کے یہاں جائے وہ اُن کی امامت نہ کرے، بلکہ خود اسی قوم کا کوئی شخص اس فرض کو اُدا کرے۔"

ایک بار حضرت مالک بن حویرثؓ ایک قوم کی مسجد میں آئے تو لوگوں نے امامت کی درخواست کی۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا کہ رسول اللہ صلعم نے اِس سے منع فرما دیا ہے، حالانکہ بعض روایات میں اِلّا باذنهم کا استثناء موجود ہے۔ (ابوُ داوٗد)

ایک بار حضرت ابُوسعید خدری رضؓ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک قریشی نوجوان سامنے سے گزرا۔ انہوں نے اُس کو دھکیل دیا، مگر وہ باز نہ آیا، پھر دھکیلا، وہ نہ رُکا، تیسری بار پھر دھکیلا۔ نماز پڑھ چکے تو فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نماز کو اگرچہ کوئی چیز توڑ نہیں سکتی، تاہم اگر کوئی چیز سامنے آ جائے تو جہاں تک ممکن ہو اُس کو دفع کرو وہ شیطان ہے۔ (ابُو داؤد)

ایک بار حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے جنابت میں ایک بال کو بھی خشک چھوڑ دیا، اس پر دوزخ میں یہ اور یہ عذاب ہوگا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اِس پر جس شدت سے عمل کیا اس کو خود انہوں نے بیان کیا ہے:-

فمن ثم عادیت راسی فمن ثم عادیت راسی فمن ثم عادیت راسی (ابوداؤد)	"اِسی دن سے مَیں نے اپنے سَر سے دشمنی کرلی، دشمنی کرلی، دشمنی کرلی (یعنی برابر سر مُنڈ داتا رہا)

رسول اللہ صلعم نے شوہر کے علاوہ اور اعزّہ کے ماتم کے لیے صرف تین دن مقرر فرمائے تھے۔ چنانچہ صحابیات نے اس کی اِس شدّت کیساتھ پابندی کی کہ جب حضرت زینب بنت جحش کے بھائی کا انتقال ہوگیا تو چوتھے دن کچھ عورتیں ان سے ملنے آئیں۔ انہوں نے ان سب کے سامنے خوشبو لگائی، اور کہا کہ مجھ کو خوشبو کی کوئی ضرورت نہ تھی لیکن مَیں نے آپؐ سے منبر پر سُنا ہے کہ کسی مسلمان عورت کو شوہر کے سوا تین دن سے زیادہ کسی کا ماتم کرنا جائز نہیں، اِس لیے یہ اُسی حکم کی تعمیل ہے۔ (ابُوداؤد)

جب حضرت اُمِّ حبیبہؓ کے والد نے انتقال کیا، تو انہوں نے تین روز کے بعد تیل لگایا، خوشبو ملی اور کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہ تھی، بلکہ صرف اس حکم کی تعمیل تھی۔ (ابُو داوٗد)

پہلے یہ دستور تھا کہ جب صحابہؓ کرام سفرِ جہاد میں منزل پر قیام فرماتے تھے تو اِدھر اُدھر پھیل جاتے تھے۔ ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ یہ تفریق و تشتّت شیطان کا کام ہے۔ اس کے بعد صحابہؓ کرام رضؓ نے اس کی اِس شدّت سے پابندی کی کہ جب منزل پر اُترتے تھے تو اِس قدر سمٹ جاتے تھے کہ اگر ایک چادر تان لی جاتی تو سب کے سب اُس کے نیچے آجاتے۔ (ابُو داوٗد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کے متعلق جو احکام جاری فرمائے تھے، اُن میں ایک یہ تھا:

لا یبیع حاضر لباد۔ "شہری لوگ بدوؤں کا مال نہ بیچیں۔"

اِس غرض سے ایک بدو حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ کے پاس آیا۔ لیکن انہوں نے کہا مَیں تو تم سے نہیں خرید سکتا، البتہ بازار میں جاؤ، بائع کی تلاش کرو، مَیں صرف مشورہ دے دوں گا۔ (ابُو داوٗد)

حضرت حذیفہ کے سامنے مدائن کے ایک رئیس نے سونے کے پیالے میں پانی پیش کیا۔ اُنہوں نے اُٹھا کر پھینک دیا اور فرمایا کہ میں نے اسکو منع کیا تھا، یہ باز نہ آیا۔ رسول اللہ صلعم نے اسکی ممانعت فرمائی ہے۔ (ابُو داوٗد)

حضورؐ نے مردوں کے لیے حریر و ریشم کا لباس پہننے کی ممانعت فرمائی تھی، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے ایک بار بازار میں کپڑا خریدا، دیکھا تو اس میں حریر کے

دھاگے نظر آئے، فوراً واپس کر دیا۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے یمن کی گورنری پر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو روانہ فرمایا، ان کے بعد حضرت معاذ بن جبلؓ کو بھیجا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ آئے تو دیکھا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے سامنے ایک مجرم کھڑا ہوا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ نے حضرت معاذ رضؓ سے اُترنے کو کہا۔ لیکن انھوں نے مجرم کی طرف اشارہ کر کے پوچھا، یہ کون ہے؟ بولے، یہودی تھا، اسلام لا کر مُرتد ہو گیا۔ فرمایا، جب تک خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق قتل نہ کر دیا جائیگا، مَیں نہ اُتروں گا۔ انھوں نے دوبارہ، سہ بارہ اُترنے کے لیے اصرار کیا۔ لیکن ان کا یہی جواب تھا۔ چنانچہ جب وہ قتل ہو چکا تو وہ سواری سے اُترے۔ (ابوداؤد)

ایک بار حضرت ابوبکر رضؓ ایک مجلس میں آئے، ایک شخص تعظیم کے لیے اُٹھا۔ اُنھوں نے بیٹھنے سے انکار کیا اور کہا کہ رسول اللہ صلعم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد)

ایک بار حضرت عائشہ رضؓ کے پاس ایک سائل آیا، انھوں نے روٹی کا ایک ٹکڑا دے دیا۔ پھر اس کے بعد ایک خوش لباس شخص آیا۔ انھوں نے اس کو بٹھا کر خوب کھانا کھلایا۔ لوگوں نے اس تفریق پر اعتراض کیا، تو بولیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

انزلوا الناس منازلھم۔ "ہر شخص سے اس کے درجہ کیمطابق برتاؤ کرو۔" (ابوداؤد)

ایک بار آپؐ مسجد سے نکل رہے تھے کہ راستے میں آپؐ نے دیکھا کہ مَرد

عورت مل جل کر چل رہے ہیں۔ آپؐ نے عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا "پیچھے رہو، تم وسطِ راہ سے نہیں گزر سکتیں"۔ اس کے بعد یہ حال ہو گیا کہ عورتیں اسقدر گلی کے کنارے چلتی تھیں کہ ان کے کپڑے دیواروں سے اُلجھ جاتے تھے۔ (ابوداؤد)

حضرت محمد بن اسلم نہایت کبیر السّن صحابی تھے۔ لیکن جب آپ بازار سے پلٹ کر آتے اور چادر اُتار کر رکھتے تو کہتے کہ خُدا کی قسم میں نے مسجد رسولؐ میں نماز نہیں پڑھی، حالانکہ آپؐ نے ہم سے فرمایا تھا کہ جو شخص مدینہ میں آئے تو جب تک اس مسجد میں دو رکعت نماز نہ پڑھ لے گھر کو واپس نہ جائے، یہ کہہ کر چادر اُٹھاتے اور مسجدِ نبوی میں دو رکعت نماز پڑھ کر گھر واپس آتے۔ (اسد الغابہ)

حضرت سفیانؓ جب حالتِ کفر میں تھے تو صحابہ کرامؓ ان سے سخت عداوت رکھتے تھے۔ لیکن غزوۂ احزاب میں آپؐ نے حضرت حذیفہؓ کو حکم دیا کہ کفّار کی خبر لائیں، لیکن اُن سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں، وہ آئے تو دیکھا کہ سفیان آگ تاپ رہے ہیں۔ کمان میں تیر جوڑ لیا اور نشانہ لگانا چاہا، لیکن رسول اللہ صلعم کا حکم یاد آ گیا اور رُک گئے۔ (مسلم)

جو صحابہؓ رافع بن ابی الحقیق یہودی کے قتل کرنے کے لیے گئے تھے، اُن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ اس کے بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کریں، ان لوگوں نے اس شدّت کے ساتھ اس حکم کی پابندی کی کہ ابن ابی الحقیق کی عورت نے باوجودیکہ اس قدر شور کیا کہ قریب تھا کہ ان کا راز فاش ہو جاتا، لیکن ان لوگوں نے صرف آپؐ کے حکم کی بناء پر اس پر

ہاتھ اُٹھانا پسند نہ کیا۔ (موطّا امام مالکؒ)

صحابہؓ کرامؓ نے علمِ حدیث کیونکر حاصل کیا

صحابہ کرامؓ سے زیادہ کوئی شخص رسول اللہ صلعم کے فیضِ صحبت کا مشتاق نہ تھا۔ لیکن اس کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ مشکوٰۃِ نبوّت سے اقتباسِ نور کریں۔ حضرت عمرؓ عوالی میں قیام رکھتے تھے جو مدینہ سے کسی قدر دُور ہے۔ اس لیے آپؐ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہنا ممکن نہ تھا۔ تاہم یہ معمول بنالیا تھا کہ ایک روز خود آتے تھے اور دُوسرے روز اپنے پڑوسی حضرت عتبانؓ بن مالکؓ کو بھیجتے تھے تاکہ خرمنِ نبوّت کی خوشہ چینی سے کسی دن محروم نہ ہونے پائیں۔ (بخاری)

بعض صحابہؓ کو اِس کا اس قدر شوق تھا کہ ایک بات کیلئے برسوں آپؐ کی خدمت میں قیام کرتے تھے۔

حضرت نواسؓ بن سمعان کا بیان ہے کہ لوگ جب آپؐ کے پاس سے رخصت ہوتے تھے تو کچھ پوچھ کر نہیں جاتے تھے، لیکن مجھے گناہ و ثواب کی حقیقت دریافت کرنی تھی، اس کے لیے میں نے ایک سال تک قیام کیا۔ اس کے بعد آپؐ سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا، نیکی، حسنِ خلق کا نام ہے۔ اور گناہ وہ ہے جو خود تمہارے دل میں کھٹکے، اور لوگوں پر اس کا افشا ہونا تمہیں ناگوار ہو۔ (مُسلم)

اِس طرح جن بزرگوں کو آپؐ کے فیضِ صحبت سے متمتع ہونے کا جس

قدر موقع ملتا تھا اُسی قدر ان کے پاس احادیث کا ذخیرہ زیادہ جمع ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضؓ پر جب کثرتِ روایتِ حدیث کا الزام لگایا گیا تو انھوں نے اس کا یہ جواب دیا:

ان اخوتی من المهاجرین کان یشغلهم الصفق بالاسواق وکنت الزم رسول الله صلى الله عليه وسلم على ملأ بطنی فاشهد اذا غابوا واحفظ اذا نسوا وکان یشغل اخوتی من الانصار عمل اموالهم وکنت امرأ مسکینا من مساکین الصفة اعی حین ینسون۔

(بخاری)

"میرے بھائی مہاجرین تجارت میں اور میرے بھائی انصار کھیتی باڑی میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن میں مساکینِ صفہ کا ایک فرد تھا، اس لیے ہر وقت رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ اس بناء پر جب وہ لوگ غائب ہوتے تھے، تو میں آپؐ کی خدمت میں موجود رہتا تھا، جب یہ لوگ بھولتے تھے تو میں یاد کیا کرتا تھا۔"

(بخاری)

وہ معاش کی ضرورت کے علاوہ خود حدیثِ نبوی کے نہایت مشتاق تھے، اس لیے آپؐ سے سوالات کیا کرتے تھے، اور آپؐ شوق سے ان کا جواب دیتے تھے۔

ایک بار انھوں نے آپؐ سے دریافت کیا کہ قیامت کے دن آپؐ کی شفاعت سے سب سے زیادہ بہرہ ور کون ہوگا؟ فرمایا، میرا خیال تھا کہ تم سے پہلے کوئی اِس کا سوال نہ کرے گا، کیوں کہ تم حدیث کے بڑے

حریص ہو۔ (بخاری)

اِن بزرگوں سے الگ ازواجِ مطہراتؓ، اور ازواجِ مطہراتؓ میں حضرت عائشہؓ تھیں، جن کو رسول اللہ صلعم سے سب سے زیادہ تقرّب حاصل تھا۔ اِس لیے خصوصیت کے ساتھ رسول اللہ صلعم کے افعال اور اقوال کے سُننے اور دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ احادیث میں نہایت کثرت سے اِس قسم کے واقعات ملتے ہیں، جن میں حضرت عائشہ رضؓ نے اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر صحابہ رضؓ کی روایات پر نکتہ چینی کی۔ اہلِ بیت میں بھی جو لوگ متفحص ہوتے تھے وہ ازواجِ مطہرات ہی کے ذریعہ سے اس مقصد میں کامیاب ہوتے تھے۔

حضرت میمونہ رضؓ، حضرت ابنِ عباس رضؓ کی خالہ تھیں، وہ ان کے یہاں اِس غرض سے سوتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازِ شب کی کیفیت ملاحظہ کریں۔ (ابو داؤد)

صحابہ کرامؓ کا شوقِ حدیث صرف رسول اللہ کے فیضِ صحبت تک محدود نہ تھا، بلکہ وہ خود اس روحانی خزانہ کی تلاش میں طرح طرح کی مشقتیں برداشت کرکے سینکڑوں کوس کا سفر کرتے تھے۔ حضرت فضالہ بن عبید رضؓ مصر کے گورنر تھے۔ ایک صحابی اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں ملاقات کیلئے نہیں آیا۔ میں اور آپ دونوں نے رسول اللہ صلعم سے حدیث سُنی تھی، اسلئے مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کو اس کا علم ہو۔ (ابو داؤد)

حضرت عبداللہ بن انیس جہنی رضؓ مصر میں مقیم تھے۔ وہ قصاص کے متعلق ایک حدیث کی روایت کرتے تھے۔ حضرت جابر رضؓ کو معلوم ہوا تو بازار میں اُکر۔

ایک اونٹ خریدا اور اُس پر کجاوہ کس کر مصر کو روانہ ہوئے۔ ایک مہینے میں مصر پہنچے اور لوگوں سے پوچھتے ہوئے اُن کے دروازہ پر گئے اور ایک حبشی غلام کے ذریعہ ان کو اطلاع دی۔ جب اُن کو معلوم ہوا کہ وہ صحابی ہیں تو آکر لپٹ گئے اور پوچھا کہ آپ کیوں تشریف لائے؟ بولے کہ قصاص کے متعلق آپ جس حدیث کی روایت کرتے ہیں، اب آپ کے سوا اس کا کوئی راوی نہیں ہے، اِس لیے میں نے چاہا کہ قبل اس کے کہ ہم دونوں میں سے کسی کی موت آئے، میں آپ سے اس حدیث کو سُن لوں۔ (حسن المحاضرہ)

ایک موقعہ پر رسول اللہ صلعم نے ایک حدیث بیان فرمائی تھی۔ حضرت سائب بن خلاد اور حضرت عقبہ بن عامر رض اس موقعہ پر موجود تھے۔ لیکن بعد میں حضرت سائب رض کو اس حدیث کے متعلق وہم پیدا ہوا اور وہ ازالۂ شک کے لیے مصر میں حضرت عقبہ رض کے پاس گئے اور پہلے مسلمہ بن مخلد کے دروازے پر حاضر ہوئے، انہوں نے اُن کو مہمان بنانا چاہا، لیکن انہوں نے کہا کہ پہلے عقبہ رض سے میری ملاقات کرا دیجئے۔ وہ ایک گاؤں میں تھے، لہذا وہاں گئے، اور اس حدیث کی تصدیق کر کے واپس آئے۔

اِس کے علاوہ صحابۂ کرام سینکڑوں طریقے سے احادیث کو جمع کرتے تھے۔

ایک بار حضرت زید بن خالد الجہنی آستانۂ مبارک پر ٹیک لگا کر سوئے اور آپ ؐ کی نمازِ شب کی کیفیت ملاحظہ فرمائی۔

ایک بار ایک صحابی نماز پڑھ رہے تھے، آپ ؐ نے اُن سے کچھ کہا جس

کو اور صحابہ نے نہیں سُنا۔ جب وہ پلٹے تو تمام صحابہ نے گھیر لیا کہ آپ سے کیا فرمایا تھا۔ (ابنِ ماجہ)

ایک بار حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو لکھا کہ نماز کے سلام کے بعد آپؐ کیا دُعا پڑھتے تھے؟ تو انہوں نے وہ دُعا لکھ بھیجی۔ (ابوداؤد)

اِس تفحص و تلاش کے ذریعہ سے کانِ سعادت کے یہ موتی جب دامن میں آجاتے، تو صحابۂ کرام نشے سے مست ہو جاتے تھے۔

حضرت ابن الحنظلیہ ایک خاموش اور گوشہ نشین صحابی تھے۔ ایک روز وہ حضرت ابوالدرداء رضؓ کے پاس سے ہو کر گزرے تو انہوں نے ان کو دیکھ کر کہا، کلمنا تنفعنا ولا تضرنا "کچھ فرمائیے، جو ہم کو نفع دے، ہم کو مضر نہ ہو"۔۔۔ انہوں نے ایک حدیث بیان کی، تو حضرت ابوالدرداء رضؓ اس قدر مسرور ہوئے کہ سَر اٹھا کر کہا۔ آپ نے رسول اللہؐ صلعم سے یہ سُنا ہے اور بار بار اس جُملہ کو دُہراتے رہے۔ اسی طرح وہ متعدد باران کے پاس سے گذرے اور انہوں نے کلمۂ نافعہ کی استدعا کی، اور انہوں نے ایک حدیث بیان کر دی۔

خود نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ "میری حدیثیں محفوظ کرو، اور دوسروں تک پہنچاؤ۔"

عن ابن مسعود قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول نضر اللہ عبدا سمع منا شیئاً فبلغہ کما سمعہ فرب مبلغ اوعی

"حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے مروی ہے کہ میں نے حضورؐ کو ارشاد فرماتے ہوئے سُنا کہ، خدا اس بندے کو تر و تازہ رکھے جو مجھ سے ذرا سی

له من سامع (ترمذی)

بات بھی سُنکر دوسرے کو ویسی ہی پہنچا دے جیسی سُنی، بہت سے پہنچائے ہوئے (لوگ خود) سُننے والے سے زیادہ یاد رکھتے ہیں۔" (ترمذی)

عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللّٰھم ارحم خلفائی قلنا یا رسول اللہ ومن خلفائک قال الذین یروون احادیثی ویعلمونھا الناس۔

(اوسط طبرانی)

"حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ 'اے اللہ! میرے خلفاء پر رحم کر' ہم نے عرض کیا کہ آپ کے خلفاء کون ہیں؟ ارشاد فرمایا' جو میری حدیثیں روایت کرتے ہیں اور حدیثوں کی اوروں کو تعلیم دیتے ہیں"

(اوسط طبرانی)

حضرت ابوعبدالرحمٰن سلمی اکابر تابعین میں سے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

حدثنا الّذین کانوا یقرؤن القرآن من اصحاب النبی صلعم انھم اذا تعلموا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر آیات لم یجاوزوھا حتی یتعلموا ما فیھا من العلم والعمل فتعلمنا

"صحابہ میں سے وہ حضرات جو ہمیں قرآن پڑھایا کرتے تھے انہوں نے ہم سے بیان کیا کہ جب وہ نبیؐ کریم صلعم سے قرآن کی دس آیتیں سیکھتے، تو آگے نہیں بڑھتے، تاوقتیکہ ان کے علم وعمل کو اچھی طرح سیکھ

القرآن والعلم والعمل ۔ | نہیں لیتے ۔ تو ہم نے قرآن کو اس
(مختصر الصواعق لابن قیم) | طرح سیکھا کہ علم و عمل دونوں کی
| بیک وقت تعلیم حاصل کی"۔ (الصواعق)

تعلیمِ حدیث

صحابۂ کرام رضؓ اشاعتِ حدیث کے لیے تمام ممالکِ مفتوحہ میں پھیل گئے تھے' اور لوگوں کو نہایت شوق کے ساتھ حدیث کی تعلیم دیتے تھے۔ حضرت ابوادریس خولانی کا بیان ہے کہ میں حمص کی مسجد میں گیا تو ایک حلقہ میں' جس میں ۳۲ صحابہؓ تھے' بیٹھ گیا۔ ایک شخص روایتِ حدیث کر چکتا تو دوسرے صاحب اس سلسلہ کو شروع کرتے۔ (مسند جلد ۵)

خضر بن عاصم لیثی کا بیان ہے کہ میں کوفہ کی مسجد میں گیا' تو ایک حلقہ نظر آیا۔ جو نہایت خاموشی کے ساتھ ایک شخص کی طرف کان لگائے ہوئے تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حضرت حذیفہ رضؓ بن یمان ہیں۔ (مسند جلد ۵)

حضرت ابو الدرداء رضؓ دمشق میں رہتے تھے' اور جب درس دینے کے لیے مسجد میں آتے تھے' تو اُن کے ساتھ طلبہ کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا جیسے بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ)

لیکن علمِ حدیث کا سب سے بڑا دارالعلم مدینہ تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ خاص مسجدِ نبوی میں بیٹھ کر حدیث کا درس دیتے تھے۔ علامہ سیوطی رحؒ حسن المحاضرہ میں لکھتے ہیں:

كان لجابر بن عبد الله حلقة في المسجد يؤخذ عنه العلم۔	جابر بن عبداللہ رضؓ کا حلقۂ درس مسجد نبوی میں تھا۔ لوگ اُن سے علم حاصل کرتے تھے (حسن المحاضرہ جلد ۱)

ابوالعالیہ سے روایت ہے کہ ہم بصرہ میں صحابہ رضؓ کی مرویات سُنتے تھے، لیکن اس پر کافی اعتماد نہ ہوتا تھا، اِس لیے خود مدینہ میں آکر اُن کی زبان سے ان کو سُنتے تھے۔ (مسند دارمی)

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کا بیان ہے کہ اکثر حدیثیں انصار کے یہاں ملیں۔

بعض صحابہ رضؓ کو اگرچہ سلطنت کی طرف سے روایتِ حدیث کی ممانعت تھی۔ لیکن سلطنت کا دباؤ ان کو اِس مقدّس فرض کے اَدا کرنے سے روک نہیں سکتا تھا۔ حضرت ابوذر غفاری رضؓ اِسی قسم کے صحابی تھے، لیکن وہ علانیہ کہتے تھے کہ اگر تم لوگ میری گردن پر تلوار رکھ دو اور مجھے معلوم ہو کہ ایک کلمہ بھی جس کو میں نے رسول اللہ صلعم سے سُنا ہے اَدا کر سکوں گا، تو قبل اس کے کہ تلوار اپنا کام کرے، میں اُس کو ادا کر دوں گا۔ (بخاری)

خود امراء و سلاطین کو ضرورت ہوتی تھی، تو وہ صحابۂ کرام کو طلب فرماتے تھے اور روایتِ حدیث کی درخواست کرتے تھے:

ایک دن حضرت زید بن ثابت رضؓ ٹھیک دوپہر کے وقت مروان کے دربار سے نکلے۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ مروان نے ان کو اس وقت کیوں

تکلیف دی؟ ان سے دریافت کیا تو فرمایا کہ مجھ سے بعض حدیثوں کے متعلق پوچھا تھا۔ (ترمذی)

امیر معاویہ رضؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن شبل کو لکھ بھیجا تھا' کہ لوگوں کو احادیث کی تعلیم دو' اور جب میرے خیمہ کے پاس کھڑے ہو تو مجھے حدیثیں سُناؤ۔ (مسند۔ جلد ۳)

لوگ' صحابۂ کرام کی خدمت میں طالب علمی کے لیے آتے تھے' تو وہ نہایت کشادہ دلی کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کرتے تھے۔ حضرت ابوہارون عبدی کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت ابوسعید خدری رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ مرحبا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تمہارے پاس دنیا کے گوشے سے بہت سے لوگ علم حاصل کرنے آئیں گے' تم لوگ اُن کے ساتھ بھلائی کرنا۔ (ترمذی ابواب العلم)

حضرت حسن بصری رحؒ سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک بار حضرت ابوہریرہ رضؓ کی عیادت کو گئے' جب آدمیوں سے اُن کا گھر بھر گیا' تو انہوں نے خاکساری سے اپنے پاؤں سمیٹ لیے' اور فرمایا کہ میرے بعد تمہارے پاس لوگ تحصیلِ علم کے لیے آئیں گے' اُن کو مرحبا کہنا' تحیت دینا اور علم سکھانا۔ (ابن ماجہ)

ایک بار حضرت سعد بن ہشام مدینہ آئے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ سے وتر کی کیفیت پوچھی۔ انہوں نے کہا کہ حضرت عائشہ رضؓ آپؐ کے وتر کی بہت بڑی عالم ہیں۔ انہوں نے حضرت حکیم بن افلح کے ساتھ

ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہا۔ انہوں نے انکار کیا تو ان کو قسم دلائی اور اب وہ ساتھ ہو گئے۔ دروازہ پر اِذن طلب کیا تو بولیں، کون؟ بولے حکیم بن افلح! پھر فرمایا، ساتھ میں کون ہے؟ بولے، سعد بن ہشام۔ فرمایا، ہشام بن عامر جو اُحد میں شہید ہوئے؟ بولے، ہاں۔ فرمایا، نہایت اچھے آدمی تھے۔ اِس تعارف کے بعد انھوں نے کہا کہ، آپؐ کے خُلق کا حال بیان فرمائیے۔ بولیں، آپؐ کا خُلق قرآن تھا۔ کیا تم قرآن نہیں پڑھتے؟ پھر پوچھا، آپؐ رات کو تہجّد کیونکر پڑھتے تھے؟ بولیں، کیا تم سورۂ مزّمّل نہیں پڑھتے؟ اِس کے بعد اس تفصیل کے ساتھ ان کے تمام سوالات کے جواب دیئے کہ انہوں نے پلٹ کر حضرت عبداللہ بن عبّاس رضؓ سے کہا، خدا کی قسم اس کا نام حدیث ہے۔ (ابو داؤد)

صحابۂ کرام رضؓ حدیث کی روایت کرتے، تو طالبانِ حدیث کا ہجوم ہو جاتا۔ ایک بار شُفَی اَصبحی رضؓ مدینہ آئے تو دیکھا کہ ایک شخص کے گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ پوچھا، یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا، ابو ہریرہ رضؓ۔ وہ درس دے چکے تو انہوں نے تنہائی میں جا کر ایک حدیث کی درخواست کی۔ (ترمذی، ابواب الزہد)

حضرت ابو سعید خدری رضؓ روایتِ حدیث کرتے تھے تو سامنے آدمیوں کی دیوار کھڑی ہو جاتی تھی۔ (مسلم کتاب الصلوٰۃ)

ایک صحابی حدیث بیان کرتے تھے تو ان کے گرد آدمیوں کا اس قدر ہجوم ہو جاتا تھا، کہ اُن کو کوٹھے پر چڑھ کر حدیث بیان کرنی پڑتی

تھی۔ (مسند جلد ۵)

صحابۂ کرامؓ اور اتباعِ حدیث

صحابۂ کرام رضؓ کا دور سنہ ۱۱ھ سے شروع ہوا اور دوسری صدی ہجری کے آغاز تک قائم رہا۔ مدینہ کے صحابہ میں حضرت سہل بن سعد بن مالکؓ آخری صحابی ہیں، جنہوں نے باختلافِ روایت سنہ ۸۸ھ یا سنہ ۹۱ھ میں چھیانوے ۹۶ یا سو ۱۰۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔

خود حضرت سہل بن سعد رضؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں مر جاؤں تو رسول اللہ صلعم سے روایت کرنے والا تم کو دوسرا نہ ملے گا۔ (استیعاب) حضرت انس بن مالکؓ آخری صحابی تھے جو بصرہ میں رہ گئے تھے۔ خود ان سے ایک شخص نے پوچھا کہ اب کوئی صحابی باقی ہے یا نہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ دیہات کے چند اعرابی البتہ باقی ہیں جنہوں نے آپؐ کی زیارت کی ہے، لیکن اب کوئی ایسا شخص نہیں جس نے رسول اللہ صلعم کی صحبت اٹھائی ہو۔ (ابن صلاح)، لیکن انہوں نے باختلافِ روایت سنہ ۹۱ھ یا سنہ ۹۲ھ یا سنہ ۱۱۰ھ میں سو ۱۰۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اِن کے بعد صرف حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضؓ ایک صحابی رہ گئے تھے، جنھوں نے سنہ ۱۰۰ھ میں مکہ میں وفات پائی۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ آج میرے سوا روئے زمین پر کوئی ایسا شخص نہیں، جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو۔ (استیعاب)

بہرحال عام روایات کی بنا پر پہلی صدی کے ختم ہونے کے ساتھ صحابۂ کرامؓ کا دَور بھی ختم ہوگیا اور وہ نورانی صورتیں دُنیا کی آنکھوں سے چھُپ گئیں، جنھوں نے ایک صدی تک دُنیا کو بقعہ نور بنائے رکھا تھا۔ اب صرف اُن کے اعمالِ صالحہ رہ گئے۔ اس دَورِ مبارک کے ۲ حصے ہیں۔ کبار صحابہؓ جو ۱۱ھ سے ۴۰ھ تک ہے۔ صغار صحابہؓ اور اُن کے تلامذہ، تابعین، یہ دَورِ حکومت حضرتِ معاویہ رضؓ ۴۱ھ سے شروع ہوا اور دوسری صدی ہجری کے آغاز تک قائم رہا۔

کبارِ صحابہؓ

رسول اللہ صلعم کا وصال ہوا تو حضرت ابُوبکر رضؓ خلیفہ منتخب ہوئے۔ سُوءِ اتفاق سے اُن کے خلیفہ ہونے کے ساتھ ہی اکثر اہلِ عرب مرتد ہو گئے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضؓ کے عزم صادق اور مہاجرین اور انصار کی قوّتِ ایمانیہ نے اِس حالت میں نہایت کامیاب طریقہ سے ستونِ اسلام کو قائم رکھا۔

شیخین کے فتاوےٰ و احکام کا دار و مدار صرف ۲ چیزوں پر تھا:

(۱) قرآنِ پاک: کیونکہ وہی دین و ملّت کی بنیاد ہے اور چونکہ وہ اُن ہی کی زبان میں نازل ہوا تھا، وہ اس کو نہایت واضح طور پر سمجھتے تھے، اس کے ساتھ اُن کو خصوصیت کے ساتھ اسبابِ نزول کا علم تھا اور اُس وقت عرب کے علاوہ اور کوئی شخص اُن میں شامل نہیں ہوا تھا۔

(۲) احادیثِ نبوی: چنانچہ جب کوئی حدیث مِل جاتی تھی تو وہ لوگ بالاتفاق اس کا اتباع کرتے تھے اور جو شخص اس روایت کی تصدیق

کرتا تھا۔ اِس پر اعتماد کرتے تھے۔

اِس بنا پر جب حضرت ابُوبکر رضؓ کے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو پہلے وہ کتاب اللہ پر نظر ڈالتے، اگر اس میں اس کا حکم مل جاتا تو اُسی پر فیصلہ کرتے۔ لیکن اگر کتاب اللہ میں وہ حکم نہ ملتا تو حدیث پر نظر دوڑاتے، اگر اُنکے پاس کوئی قابلِ فیصلہ حدیث ہوتی، تو اُسی کے مطابق فیصلہ کرتے۔ لیکن اگر تلاش کے بعد بھی حدیث نہ ملتی تو لوگوں سے دریافت فرماتے کہ اس مسئلہ میں تم کو رسول اللہ صلعم کا کوئی فیصلہ معلوم ہے۔ اس حالت میں اکثر لوگ اُٹھ کر کہتے کہ آپؐ نے اِس معاملہ میں یہ یہ فیصلہ کیا ہے۔

حضرت عمر رضؓ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ لیکن اگر اُن کو وہ مسئلہ قرآن و حدیث میں نہ ملتا تو اُس کے متعلق حضرت ابُوبکر رضؓ کا فتوےٰ دریافت فرماتے۔ اگر حضرت ابوبکر رضؓ کا کوئی فیصلہ موجود ہوتا اور اُن کو اُس کے خلاف کوئی بات معلوم نہ ہوتی تو اُسی کے مطابق فیصلہ کرتے اسی احتیاط فی القبول کیساتھ حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔

صحابۂ کرام رضؓ کے سامنے ایسے مسائل بھی پیش ہوتے تھے، جن کے متعلق قرآن و حدیث میں کوئی تصریح نہیں ہوتی تھی، اِس حالت میں مجبوراً اُن کو قیاس کرنا پڑتا تھا۔ جس کو وہ لوگ "رائے" سے تعبیر کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت ابُوبکر رضؓ قرآن مجید میں کوئی تصریح نہ پاتے اور لوگوں کے پاس حدیث بھی نہ ملتی تو لوگوں کو جمع کرکے اُن سے مشورہ لیتے اور جب کسی چیز پر اُن کا اتفاقِ رائے ہوجاتا تو اسی کے مطابق فیصلہ کرتے حضرت عمر رضؓ

کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔ چنانچہ جب شریح رضؓ کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا تو ان کو ہدایت کی کہ جو کچھ تمہیں کتاب اللہ سے معلوم ہو سکے اس کو اُسی میں دیکھ لو، اور اُس کے متعلق کسی سے دریافت نہ کرو، اور جو چیز تم کو اُس میں نہ معلوم ہو سکے اس کے متعلق حدیثِ نبوی کا تتبع کرو اور جو چیز تم کو حدیث میں بھی معلوم نہ ہو اس میں اپنی رائے سے اجتہاد کرو۔ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ کو لکھا کہ قضاءت فریضہ محکمہ یا سُنّتِ متبعہ کا نام ہے لیکن جو چیز تم کو قرآن و حدیث سے نہ ملے اور تم کو اُس کی نسبت شبہہ ہو، تو اُس پر غور کرو اور خوب غور کرو، اس کے ہم صُورت اور ہم شکل واقعات کو دریافت کرو، پھر ان سے قیاس کرو۔

حضرت عمر رضؓ سے روایت ہے کہ وہ ایک آدمی سے ملے تو فرمایا کہ تمہارے معاملہ میں کیا ہوا۔ اس نے کہا کہ علیؓ اور زیدؓ نے یہ فیصلہ کیا۔ بولے اگر میں ہوتا تو یہ فیصلہ کرتا، اُس نے کہا کہ آپ کو کس نے روکا ہے۔ خلیفہ تو خود آپ ہیں۔ بولے اگر میں تم کو قرآن و حدیث کی طرف لوٹا سکتا تو انہی کی طرف لوٹاتا۔ لیکن میں تم کو اپنی رائے کی طرف لوٹاتا ہوں۔ اور رائے ایک مشترک چیز ہے۔ اِس بنا پر انہوں نے حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ کے فیصلہ کو منسُوخ نہیں کیا۔

قرآنِ مجید کے بعد صحابہ رضؓ کا محورِ عمل رسول اللہ کی ذات تھی، اس لیے وہ تمام اعمال میں آپؐ کی سنّت کا اتّباع کرتے تھے۔ "سنّت عادیہ و اتفاقیہ" کا اگرچہ اتّباع ضروری نہیں، لیکن صحابۂ کرام رضؓ اُس تک کی اتّباع کا

اہتمام غایت درجہ اجزاء دین کے برابر کرتے تھے۔

حضرت ابوالدرداء رضہ جب کوئی بات کہتے تھے تو مسکرا دیتے تھے۔ کسی نے کہا کہ اس عادت کو ترک کر دیجیے ورنہ لوگ آپ کو احمق بنائیں گے۔ بولے میں نے رسول اللہ صلعم کو دیکھا ہے کہ جب بات کہتے تھے تو مسکرا دیتے تھے۔ (مسند ابن حنبل ؒ)

ایک بار حضرت علی کرم اللہ وجہہ سوار ہونے لگے تو رکاب میں بسم اللہ کہہ کر پاؤں رکھا، پشت پر پہنچے تو الحمد للہ کہا، پھر تین بار اللہ اکبر کہا، پھر یہ دعا پڑھی سبحٰنک انی ظلمت نفسی فاغفرلی انہ لا یغفر الذنوب الا انت پھر ہنس پڑے۔ لوگوں نے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہی پابندیوں کے ساتھ سوار ہوتے تھے اور اخیر میں ہنس پڑتے تھے۔ (ابو داؤد)

ایک صحابی آپؐ کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوئے، تو دیکھا کہ آپؐ کی قمیض کا تکمہ کھلا ہوا ہے، آپ کی تقلید میں انہوں نے بھی عمر بھر قمیض کا تکمہ کھلا رکھا۔ (مسند)

غرض اس طریقہ پر کبار صحابہ رضہ کے عہد میں احکام کے چار مآخذ تھے:

۱۔ قرآن ۲۔ حدیث

۳۔ قیاس یا رائے۔ یہ قرآن و حدیث ہی کی فرع تھی۔

۴۔ اجماع، اور یہ بدیہی بات ہے کہ وہ اپنے اجماع میں قرآن و حدیث اور قیاس ہی سے استناد کرتے ہوں گے۔

حضرت ابوبکر رضؓ جب اپنی رائے سے کوئی اجتہاد کرتے تھے تو کہتے تھے کہ یہ میری رائے ہے۔ اگر صحیح ہو تو خدا کی جانب سے ہے اور اگر غلط ہو تو میری جانب سے، اور میں خدا سے استغفار کرتا ہوں۔

حضرت عمرؓ کے ایک محرر نے لکھا کہ یہ خدا کی رائے اور عمرؓ کی رائے ہے تو انھوں نے کہا کہ یہ نہایت بُری بات ہے۔ یہ عمرؓ کی رائے ہے، اگر صحیح ہو تو خدا کی جانب سے ہے اور اگر غلط ہو تو عمر کی جانب سے۔ اور فرمایا سنّت وہ ہے جس کو خدا اور خدا کے رسول نے مقرر کیا ہے۔ رائے کی غلطی کو اُمّت کے لیے سنّت نہ بناؤ۔ اِس دَور کے مشہور ترین مُفتی خلفائے اربعہ رضؓ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابت رضؓ ہیں۔ لیکن ان میں حضرت عمرؓ، حضرت علی رضؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ اور حضرت زید بن ثابت رضؓ نے زیادہ تر فتوے دیئے ہیں۔

احادیث اور شیخین

منکرین احادیث کی تحریروں میں بارہا یہ نظر سے گزرا ہے کہ خلفاء راشدین خصوصاً شیخین حدیثوں کو قابلِ حُجّت نہ سمجھتے تھے اور اس کے ثبوت میں وہ روایتیں لائی جاتی ہیں جن میں شیخین رضؓ سے روایات اور کتابتِ احادیث کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ ہم ان روایتوں پر ان کے بیان کے بعد آئندہ کلام کریں گے۔ اس وقت ہم صرف یہ تنبیہہ ضروری سمجھتے ہیں کہ دعوٰے اور دلیل میں انطباق نہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ،

احادیث کو ناقابلِ حجت سمجھتے تھے اور دلیل حدیثوں کے بیان کرنے اور کتابت کرنے کی ممانعت۔ کیا کسی چیز کو حجت سمجھنا اِس پر موقوف ہے کہ اس کو لکھا کرے اور بہ کثرت بیان کیا کرے؟

کتابُ اللہ کے بعد ثانوی درجہ وہ احادیثِ نبوی کو کیسے نہ دیتے؛ جب کہ نبیِ کریم صلعم نے اپنے عہدِ مبارک میں قضاء جیسے اہم معاملے کیلئے یہی ترتیب قائم فرمائی تھی۔

عن معاذ بن جبل ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لما بعثہ الی الیمن قال کیف تقضی اذا عرض الیک قضاء قال اقضی بکتاب اللّٰہ قال فان لم تجد فی کتاب اللّٰہ قال فبسنت رسول اللّٰہ ؐ..... الی آخر الحدیث
(ترمذی۔ ابوداؤد۔ دارمی)

"حضرت معاذ بن جبل رضؓ سے منقول ہے کہ حضورؐ نے جب یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو دریافت فرمایا کہ جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ آئیگا تو اُس کا فیصلہ کیسے کرو گے؟ عرض کیا، کتابُ اللہ کے موافق کرونگا۔ فرمایا، اگر تم اُس کا حکم کتابُ اللہ میں نہ پاؤ؟ عرض کیا، حضورؐ کی سنّت کے موافق فیصلہ کروں گا"
الخ (ترمذی، ابوداؤد، دارمی)

خود حضور صلعم کے ارشادات ہیں:

من اطاعنی فقد اطاع اللّٰہ ومن عصانی فقد عصی اللّٰہ (بخاری ومسلم)

"جس نے میری اطاعت کی، اُس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے

میری نافرمانی کی، اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔"

ما امرتکم بہ فخذوہ وما نھیتکم عنہ فانتھوا ۔ (ابن ماجہ)

"جس بات کا میں تم کو حکم دُوں، اُس کو کرو، اور جس سے منع کردوں اُس سے باز رہو!" (ابنِ ماجہ)

فانہ من یعش بعدی فسیری اختلافا کثیرا فعلیکم بسنتی ۔

"جو میرے بعد زندہ رہے گا، وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا سو تم میری سنّت کو لازم پکڑو"۔ (دارمی)

پھر کیسے ممکن تھا کہ خلفائے راشدین رضؓ حدیث و سنّت کو حجت نہ سمجھتے، بلکہ خود ان کا عمل کتابُ اللہ کے بعد حدیث ہی پر تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کا طرزِ عمل

کان ابوبکر اذا ورد علیہ الخصم نظر فی کتاب اللہ فان وجد فیہ ما یقضی بینھم قضی بہ وان لم یکن فی الکتاب وعلم من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ذالک الامر سنۃ قضی بہ فان اعیاہ ذالک خرج فسال المسلمین

"حضرت ابوبکرؓ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو کتاب میں غور کرتے۔ اگر اس میں اس کا حکم پاتے تو اس کے موافق فیصلہ کردیتے، اور اگر کتابُ اللہ میں اس کا حکم نہ ملتا اور حضورؐ سے اس کے بارے میں کوئی سنّت معلوم

ہوتی، تو اس کے موافق فیصلہ کرتے۔
اور اگر اس سے بھی عاجز ہوتے تو
مسلمانوں سے رائے لیتے۔"
(اعلام الموقعین)

اور خلیفہ ہوتے ہی سب سے پہلا خطبہ جو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے دیا اُس کے چند الفاظ یہ ہیں:

یا ایہا النّاس قد ولیت امرکم ولست بخیرکم ولکن نزل القرآن وسن النبی صلی اللہ علیہ وسلم السنن فعلمنا فعلمنا ایّہا النّاس انما انا متبع ولست بمبتدع فان احسنت فاعینونی وان زغت فقومونی۔
(طبقات ابن سعد جلد ۳)

"اے لوگو! میں تمہارا والی بنایا گیا ہوں، مگر میں تم سب سے افضل نہیں ہوں، بات یہ ہے کہ قرآن نازل ہوچکا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طریقے بتا کر ہم کو سکھا دیا ہے اے لوگو! میں متبع ہوں، احکام کا موجد نہیں ہوں، پس میں اگر ٹھیک چلوں تو میری مدد کرو، اور اگر میں غلطی کروں تو میری اصلاح کرو" (طبقات ابنِ سعد۔ جلد ۳)

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے اِس اصول اور طرزِ عمل کی عملی مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ حضورؐ کی وفات کے بعد ہی حضرت ابوبکر رضؓ کو حدیث ہی کیطرف

رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

صحابہ کرام رضؓ میں اختلاف ہوا کہ جسدِ اطہر کو کہاں دفن کیا جائے۔ کچھ لوگ کہتے تھے، مسجدِ نبوی میں رکھا جائے، اور کچھ لوگ کہتے تھے کہ دیگر صحابہ رضؓ کے قریب دفن کیا جائے۔ اس کا فیصلہ حضرت ابوبکر رضؓ نے ہی کیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلعم سے سُنا ہے کہ جہاں پر نبی کی رُوح قبض ہو، وہیں دفن کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کو تمام صحابہ رضؓ نے تسلیم کیا اور جائے وفات یعنی حجرۂ حضرت عائشہ رضؓ میں مزار مقدس قرار پایا اور جائے وفات کا فرش اُٹھا کر وہیں قبر شریف کھودی گئی۔ (مؤطا امام مالکؒ، ابنِ ماجہ)

اِس واقعہ سے نہ صرف حضرت ابوبکر رضؓ کا تمسک بالحدیث ثابت ہے بلکہ تمام صحابہ رضؓ کا بالاتفاق تمسک بالحدیث ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ سب نے اس کو منظور کیا اور حدیث سُننے کے بعد کسی نے اختلاف نہ کیا تو حجیّتِ حدیث پر اجماع ہو گیا۔

۲۔ حضور صلعم کی وفات کے بعد جب حضرت فاطمہ رضؓ نے حضور صلعم کی میراث مانگی تو حضرت ابوبکر رضؓ نے جواب میں حدیث پیش کی اور کتابُ اللہ کے احکامِ وراثت سے نبی صلعم کے پسماندہ کو مستثنیٰ رکھ کر حدیث پر عمل کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے مال کو وقف قرار دیا اور مطالبۂ میراث کے جواب میں فرمایا:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لانورث ما ترکنا صدقۃ (بخاری ومسلم)

یعنی حضور صلعم نے فرمایا کہ ہماری میراث تقسیم نہیں ہوتی ہم جو

کچھ چھوڑیں وہ صدقہ وقف ہے۔"

(بخاری، مسلم)

یہ واقعہ بھی صحابہ رضؓ کے سامنے ہوا اور کسی نے نکیر نہیں کی حتیٰ کہ حضرت فاطمہ رضؓ تک نے نہ کہا کہ حسبنا کتاب اللّٰہ یا حدیث حجت نہیں یا حدیث کو تشریعی حیثیت حاصل نہیں۔

۳۔ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضؓ کے پاس ایک عورت اپنے پوتے کی میراث مانگنے آئی۔ فرمایا، قرآن میں تمہارے حصّہ کا ذکر نہیں اور نہ دادی کے حصّہ کے متعلق مجھے رسول اللہ صلعم کا کوئی حکم معلوم ہے اس وقت مغیرہ بن شعبہ رضؓ موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہے۔" جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم دادی کو چھٹا حصّہ دِلواتے تھے۔" فرمایا، کوئی اور شاہد ہے؟ تو محمد بن مسلمہ رضؓ نے شہادت دی۔ اُن کی شہادت سُن کر آپ نے اُس عورت کو چھٹا حصّہ دلوا دیا۔ (ابو داؤد، تذکرۃ الحفاظ)

حضرت ابوبکر رضؓ کے بعد حضرت عمر رضؓ کا طرزِ عمل بھی یہی تھا کہ کتاب اللہ کے بعد سنّت کی طرف رجوع کرتے، بلکہ انہوں نے سنّتِ رسولؐ کے ساتھ سنّتِ ابوبکر رضؓ کو بھی شامل کیا۔ چنانچہ انہوں نے خود اپنے طرزِ عمل کو اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

انہ مضیٰ لی صاحبان لیعنی النبی صلعم و ابابکر عملا و سلکا طریقا فانی ان عملت لبغیر ھما سلک فی	"میرے دو ساتھی یعنی نبی کریمؐ اور ابوبکر صدیق رضؓ آگے جا چکے ہیں، اور ان دونوں حضرات نے ایک

غیر طریقها۔ (طبقات ابن سعد) جلد ۳

طرزِ عمل رکھا اور ایک طریقہ مقرر کیا میں اگر دونوں کے علاوہ دوسرے طرزِ عمل پر چلوں گا تو وہ طرزِ عمل مجھ کو اُن کے طریقے سے جدا کر دیگا۔"

(طبقات ابن سعد۔ جلد ۳)

حافظ ابن القیم حضرت ابوبکر رضؓ کا وہ طرزِ عمل، جو ہم نے اُوپر بیان کیا، ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وکان عمر یفعل ذالک فاذا اعیاه ان یجد ذالک فی کتاب اللّٰہ و السنة ھل کان ابوبکر قضی فیہ بقضاء فان کان لابی بکر قضاء قضی بہ والا جمع علماء الناس واستشارھم فاذا اجتمع رایھم علیٰ شئی قضی بہ۔

(اعلام الموقعین جلد ۱)

"حضرت عمر رضؓ بھی ایسا ہی کرتے تھے (یعنی اوّل کتاب پھر سنّتِ رسولؐ پر عمل) اور جب کتابُ اللہ اور سنّتِ رسول اللہ میں کچھ نہ ملتا، تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ ایسا کوئی قضیہ حضرت ابوبکر رضؓ کے سامنے بھی ہوا، اور اس میں کیا فیصلہ کیا؟ اگر کوئی ایسا فیصلہ مل جاتا تھا تو اسی کے موافق کرتے تھے، ورنہ علماء کو جمع کر کے مشورہ کرتے۔ جب ان کی رائے کسی بات پر متفق ہو جاتی تھی تو اُسکے موافق حکم دیتے۔" (اعلام الموقعین)

حضرت عمر رضؓ نے سنّتِ رسول اللہ کے بعد سنّتِ ابوبکر رضؓ کو بھی اپنے طریقِ کار کا ماخذ بنایا۔

حضرت عمر رضؓ قضات کو عہدۂ قضاء پر مامور فرمانے کے بعد خاص طور سے کتابُ اللہ اور اس کے بعد سنّتِ رسول اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے کی ہدایت فرماتے، چنانچہ جب قاضی شریح کو کوفہ کا قاضی مقرر فرمایا تو یہ ہدایت کی:

انظر ما یتبیّن لک فی کتاب اللہ فلا تسأل عنہ احدا وما لم یتبین لک فی کتاب اللہ فاتبع فیہ سنۃ رسول اللہ صلعم وما لم یتبین لک فیہ سنۃ فاجتھد فیہ رأیک۔ (اعلام الموقعین جلد اول)

"غور کرو! اگر کتابُ اللہ میں تم کو حکم مل جائے تو کسی سے اس کے متعلق مت پوچھو اور جو حکم کتابُ اللہ میں نہ ملے تو اس میں سنّتِ رسول اللہ کا اتباع کرو، اور جس حکم کے متعلق تم کو سنّت میں بھی رہنمائی نہ ملے تو پھر اس میں اجتہاد کرو۔" (اعلام الموقعین)

حضرت عمر رضؓ کا یہی طرزِ عمل رہا، یہاں تک کہ شہادت کے وقت یہ دُعا کی:

اللّٰھم انی اشھدک علیٰ امراء الامصار فانی انما بعثتھم لیعلموا الناس دینھم وسنۃ نبیھم۔ (طبقات جلد ۳)

"اے اللہ! میں آپ کو ملکوں کے حکام پر گواہ بناتا ہوں کہ، میں نے اُن کو اس واسطے بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کو دین اور نبیِ صلعم کی سنّت کی

تعلیم دیں۔" (طبقات ابنِ سعد)

پس حضرت عمر رضؓ خود بھی سنّت کو حجّت سمجھتے تھے اور تمام ممالک میں اُس کی تبلیغ و تعلیم کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے۔

شیبہ رضؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضؓ جب کہ وہ میرے پاس مسجدِ حرام میں بیٹھے تھے، فرمایا کہ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ کعبہ کا سب خزانہ مسلمانوں میں تقسیم کر دوں گا اور اس گھر میں کچھ نہ رکھوں گا۔ میں نے کہا کہ آپ کو اِس کا کیا حق ہے؟ انہوں نے کہا، کیوں؟ میں نے کہا، اس واسطے کہ آپ کے دونوں پیش رَو (حضورؐ اور ابوبکر رضؓ) نے ایسا نہیں کیا۔ فرمایا، کہ میں اِن ہی دونوں حضرات کی اقتداء کرتا ہوں۔ (بخاری جلد ۲)

سعید بن المسیبؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضؓ نے انگلیوں کی قطع کی دیت میں ایک بار کوئی فیصلہ کیا۔ اس کے بعد اس کے متعلق حضور صلعم کے حکم کا حوالہ دیا گیا، جو حضور رضؓ نے ابنِ حزم کو دیا تھا، تو حضرت عمر رضؓ نے اپنا فیصلہ منسوخ کر دیا۔ (سیرت ابن الخطابؓ لابنِ جوزیؒ)

حضرت عمر رضؓ نے ایک مرتبہ ایک پاگل زانیہ عورت پر حد قائم کرنی چاہی۔ جب حضرت علی رضؓ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے کہا کہ میں نے حضور رضؓ سے سُنا ہے کہ تین شخص مرفوع القلم ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک مجنون ہے جب تک کہ ہوش میں نہ آجائے۔ یہ حدیث سُن کر حضرت عمر رضؓ نے اس عورت کو چھوڑ دیا۔ (مسند احمد، ابو داؤد)

حضرت عمر رضؓ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا، پھر فرمایا کہ میں جانتا ہوں کہ تُو

کسی کو فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتا، لیکن چونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھ کو بوسہ دیا ہے لہٰذا میں بھی دیتا ہوں۔
(بخاری ومسلم)

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ حضرت عمرؓ جب کوئی صورت پیش آتی تو مجمع عام میں کھڑے ہو کر پوچھتے کہ اس صورت کے متعلق کسی کو کوئی حدیث معلوم ہے، تکبیرِ جنازہ، غسلِ میّت، جزیۂ مجوس اور اسی قسم کے صدہا مسائل کے متعلق آپ نے صحابہ رضؓ سے پوچھ کر احادیث کا پتہ لگایا جن کی تفصیل کتبِ احادیث میں مذکور اور مسطور ہے۔ البتہ بلا پوری تحقیق کے کسی روایت کے قبول کرنے میں جلدی نہ کرتے تھے اور یہی ہے بنا ان روایتوں کی جن کو منکرینِ حدیث پیش کرتے ہیں۔ (باقی مفصل بحث و تنقید آئندہ کریں گے) لیکن یہ کہنا کہ شیخین، ابوبکر صدیق رضؓ و عمر رضؓ حدیث کو حجت نہ سمجھتے تھے، سراسر دھوکا اور بہت بڑا بہتان ہے۔

صغار صحابہؓ

یہ دَورِ حکومت حضرت معاویہؓ یعنی ۴۱ھ سے شروع ہوا اور اُس وقت تک قائم رہا جب عربی سلطنت میں ضعف کے آثار ظاہر ہونے لگے، یعنی دوسری صدی کے آغاز تک۔ اس دَور میں مسلمانوں کے اندر سیاسی حیثیت سے فرقہ بندیاں قائم ہو گئی تھیں۔ جو لوگ حضرتِ معاویہؓ اور ان کے خاندان سے بغض و اختلاف رکھتے تھے وہ دو گروہوں میں منقسم ہوئے۔ خارجی اور شیعی، اُن کے مقابلہ میں

طرفدارانِ معاویہؓ اور عام مسلمان۔

علماءِ اسلام عام طور پر اسلامی شہروں میں پھیل گئے۔ چنانچہ مدینۂ منورہ سے نکل کر بعض صحابہ رضؓ نے معلّم اور بعض نے قاری کی حیثیت سے دوسرے اسلامی شہروں میں سکونت اختیار کرلی، یہاں تک کہ نئے شہر اُن کے وطن تسلیم کرلیے گئے اور اُن کی تعلیم وارشاد کے ذریعہ سے کبار تابعین کی ایک جماعت پیدا ہوگئی جو فتاوے میں اُن کی شریک ہوئی، اور خود صحابہ رضؓ نے بھی اُن کے حقِ شرکت کو تسلیم کیا اور انہوں نے اپنی علمی مشغولیّت اور اپنے اجتہاد کے ذریعہ سے جو درجہ حاصل کیا تھا اُس کو بلند کردیا۔ اگر مکّہ اور مدینہ کے مسلمانوں کے دلوں میں عام وقعت نہ ہوتی، اگر مکّۂ معظمہ حج کا مقام نہ ہوتا، اور مختلف العقیدہ اور مختلف المیلان مسلمان وہاں آمدورفت نہ رکھتے تو دُور دراز شہروں کے علماء میں علمی تعلّق قائم نہ ہوسکتا۔

روایتِ حدیث کی رکاوٹ کا سبب ہی دُور ہوچکا تھا اِس لیے روایتِ حدیث کا عام رواج ہوگیا چنانچہ خلفاءِ راشدین کے بعد جو صحابۂ کرام رضؓ موجود تھے، اُن کے پاس دوسرے شہروں سے لوگ فتوٰے اور تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آتے تھے۔ تمدّن کی وسعت نے بہت سی نئی ضرورتیں پیدا کردی تھیں، جن کے احکام کے متعلق اُن کو مجبوراً تحقیقات کرنی پڑتی تھی، اور اِس حالت میں صحابہ رضؓ اور ان کے شرکائے فتویٰ یعنی کبار تابعین کے سوا اُن کا کوئی دوسرا ٹھکانا نہ تھا، اِس لیے ان

حدیثوں کے ذریعہ سے جو اُن کو یاد تھیں ان کو فتوے دینا پڑتا تھا۔ لیکن ان میں بعض حدیثوں کو تو انہوں نے براہِ راست رسول اللہ صلعم سے سُنا تھا اور بعض حدیثیں کبارِ صحابہ رضہ سے سُنی تھیں۔

اِس دَور کے اصحابِ فتاوے سے حدیثوں کی ایک بہت بڑی تعداد روایت کی جاتی ہے، چنانچہ ان میں سے بعض مفتیوں کی حدیثیں ہزاروں سے زائد ہیں، لیکن کسی ایک شہر بلکہ کسی ایک کتاب میں یہ حدیثیں مجموعی طور پر نہیں پائی جاتی تھیں۔ کیونکہ جو صحابہ رضہ فتوے دینے والے تھے وہ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، اس لیے جو بزرگ جس شہر میں آئے اُس کے باشندوں نے روایت کی، اور اس لیے ایک شہر میں جن حدیثوں کی روایت کی گئی، دوسرے شہر والوں کو نہ مِل سکیں۔ اور اِس موقع پر مختلف شہروں کے علماء کے درمیان علمی تعلقات قائم ہونے میں سب سے زیادہ خانۂ کعبہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے غرضیکہ اِن تینوں بُنیادی امتیازی خصوصیات نے فتووں میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیئے اور ان میں ہر ایک خصوصیت اختلاف کے پیدا کرنے کا قوی سبب بن گئی۔ مثلاً ان خصوصیات نے شیعوں کے لیے الگ، خوارج کے لیے الگ اور تمام امت کے لیے الگ الگ فتاوے پیدا کر دیئے، جو باہم ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

اس زمانہ میں احادیث کی روایت میں جھوٹ کا بھی رواج ہوا اور حضرت ابوبکر رضہ اور حضرت عمر رضہ کو اِسی کا خوف و خطرہ تھا، چنانچہ امام

مسلمؒ نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں اس سلسلے کے بعض واقعات پر تبصرہ فرمایا ہے۔

اس وقت نے آئندہ دَور میں اہلِ حدیث کے کام کو بہت زیادہ سخت کر دیا، اور اہلِ بصیرت سے مخفی نہیں کہ اُنھوں نے ان آمیزشوں سے صحیح احادیث کو کیونکر پاک کیا اور اُن کو اس معاملہ میں کس قدر کامیابی ہوئی اور اس امر کے باعث نقد و انتقاد کے ضوابط و اصول تجویز فرما کر موضوعات کو بالکل بے نقاب کر ڈالا۔

محدثین حضرات نے صحتِ حدیث کا یہ ضابطہ تجویز فرمایا کہ حضورؐ کے قول و فعل نقل کرنے والا صحابی ہو اور صحابی تک تمام سلسلہ سند کے راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کی جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں تھے، کون لوگ تھے، کیسے تھے، کیا مشاغل تھے، چال چلن کیسا تھا، حافظہ کیسا تھا، سمجھ کیسی تھی، ثقہ تھے یا غیر ثقہ، سطحی الذہن تھے یا دقیقہ سنج، عالم تھے یا جاہل؟ وغیرہ۔

اِن جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اس میں صَرف کر دیں۔ ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہنچائیں، جو لوگ ان کے زمانے میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کیے، اِس تحقیقات کے نتیجے میں "اسماء الرجال" کا وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا، جس کی بدولت آج ہم کو لاکھوں شخصوں کے حالات

معلوم ہو سکتے ہیں۔

محدّثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رُتبہ اور حیثیت کی پرواہ نہ کی۔ بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سُراغ رسانیاں کیں اور ایک ایک کا بے لاگ تجزیہ کیا۔ اِس سلسلہ میں سینکڑوں تصانیف مرتّب ہوئیں۔

پھر موضوعات کے نقد و انتقاد کے لیے ابنؔ جوزیؒ نے روایت کے دس اصول اور ملّا علی قاری نے بارہ اصول تحریر فرمائے۔ ان اصولوں کے خلاف ہونے کی صورت میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اُس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں۔

جب حدیثیں وضع ہونے لگیں تو ائمہ دین نے اصولِ روایت و درایت کو وسعت دی اور اِس سختی کے ساتھ جانچ کی کہ سب کی قلعی کھُل گئی، نتیجہ یہ ہوا کہ واضعین کے نام تک ظاہر کر دیئے۔ ان کے قائم کردہ اصولوں نے خود واضعین کو اقرارِ وضع پر مجبور کیا۔ موضوع حدیثوں کو بھی قلم بند کیا۔ جن کتابوں میں موضوع حدیثیں ہیں، اُن کے نام بھی بتلا دیئے۔ واضعین کو بھی شمار کرایا اور شناختِ موضوعات کے اُصول بھی مقرر فرمائے۔

پس اِس بنا پر کہ احادیث میں کذب و افترا اور وضع بھی ہوا ہے تمام حدیثیں متروک نہیں ہو سکتیں۔ مانا کہ واضعین نے احادیث وضع ہی کی ہیں مگر کیا اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ اُن کے جرم کی پاداش میں صادقین کے اقوال

کو بھی جھوٹ سمجھ لیا جائے؟ یہ کون سی معقول بات ہے کہ اگر دنیا کے چند
جھوٹوں نے جھوٹ بولا ہے، اس لیے اب کسی سچے سے سچے شخص کی بات
پر بھی اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔

اہلِ رائے اور اہلِ حدیث

اس دور میں رائے اور حدیث کے درمیان
اختلاف ہوا اور ان دونوں میں ہر ایک الگ الگ اصول کے حامی
ہوئے۔ ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں کہ کبار صحابہ رض اپنے فتوؤں میں پہلے قرآنِ
پاک، پھر احادیث پر اعتماد کرتے تھے۔ لیکن جب ان دونوں میں کوئی حکم
نہ ملتا تھا تو رائے کے ساتھ جس کو وسیع معنیٰ میں "قیاس" کہا جا سکتا ہے
فتوے دیتے تھے، لیکن رائے کی طرف ان کا میلان بہت زیادہ نہ تھا،
یہی وجہ ہے کہ اُن سے رائے کی بُرائی بھی منقول ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ انہوں نے جس رائے کی بُرائی کی ہے
وہ اس رائے سے الگ ہے، جس پر انہوں نے عمل کیا ہے اِس لیے قابلِ
ذم رائے اگر ہے تو یہ ہے کہ فتوے میں خواہشِ نفس کی پیروی کی جائے،
اور اس کی اسناد دین کی کسی اصل کی طرف نہ ہو، اور قابلِ ستائش رائے وہ
ہے جس کو حضرت عمر رض نے اپنے قاضی کے لیے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے
کہ " ہم صورت اور ہم شکل واقعات کو معلوم کرو، پھر ان سے قیاس کرو،
کیونکہ اس صورت پر عمل کرنا درحقیقت قرآن و حدیث کے عقلی
مفہوم پر عمل کرنا ہے۔

شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) جب کسی حکم کے متعلق ایک جماعت سے مشورہ لیتے اور وہ لوگ اپنی رائے سے مشورہ دیتے تو لوگ اُس پر عمل کرتے، اس طریقہ کا نام "اجماع" تھا۔

الغرض جب یہ دوسری نسل پیدا ہوئی اور یہ دَور آیا تو ان میں کچھ لوگ ایسے ہوئے جو فتوٰے کو صرف حدیث تک محدود رکھتے تھے، اور اس سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ یہ لوگ ہر مسئلہ میں انہی حدیثوں کی رُو سے فتوٰے دیتے تھے جو اُن کو ملتی تھیں۔ خود ایسے روابط موجود نہ تھے جو باہم مسائل کی شیرازہ بندی کر سکیں۔ لیکن ان میں ایک گروہ ایسا بھی موجود تھا جو شریعت کو ایک عقلی اور اصولی چیز سمجھتا تھا۔ اگرچہ یہ لوگ بھی حتی المقدور عمل بالکتاب والسنۃ میں پہلے لوگوں کے مخالف نہ تھے تاہم چونکہ یہ اعتقاد تھا کہ شریعت کے عقلی وجوہ سمجھ میں آسکتے ہیں اور وہ ایسے مضبوط اصول پر قائم ہے جو خود قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں، اس لیے جب ان کو قرآن و حدیث میں کوئی تصریح نہیں ملتی تھی تو اوّل الذکر گروہ کی طرح ان کو رائے سے فتویٰ دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ لوگ احکامِ شرعیہ کے علل و اسباب اور ان کے مقاصد و اغراض کو سمجھنا چاہتے تھے اور بسا اوقات اصولِ شریعت کے مخالف ہونے کی بنا پر بعض حدیثوں کو، بالخصوص جب دوسری حدیثیں ان کے مخالف اور معارض ہوتی تھیں، رَد کر دیتے تھے۔ اہلِ عراق میں اس اصول کا زیادہ رواج ہوا۔

اہلِ حدیث اور اہلِ رائے کا مسلک یہ تھا کہ اوّل گروہ صرف ظواہر

نصوص سے غرض رکھتا تھا اوران کے علل واسباب سے بحث نہیں کرتا تھا اور رائے سے بہت کم فتویٰ دیتا تھا لیکن جو لوگ اہل الرائے تھے، وہ مفہوم عقلی پر بھی عمل کرتے تھے اور علین مدلول نص خیال کرتے تھے وہ احکام کے علل واسباب کا بھی سُراغ لگاتے تھے۔ اصول کے ذریعے باہم مسائل کی شیرازہ بندی کرتے تھے۔

ملکی تقسیم کے لحاظ سے اکثر اہلِ حجاز اہلِ حدیث اور اکثر اہلِ عراق اہلِ رائے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ربیعہؒ نے حضرت سعید بن المسیب رضؓ سے حکم کی علت دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ تم عراقی تو نہیں ہو؟

فقہائے عراق میں جن لوگوں نے رائے اور قیاس میں شہرت حاصل کی، ان میں ابراہیم بن یزید النخعی الکوفی، فقیہہ عراق بہت شہرت رکھتے ہیں۔ ابراہیمؒ کوفہ کے محدث اور عالم تھے۔ حضرت عامر بن شراحیل الشعبیؒ کے معاصر تھے، لیکن دونوں کی حالتیں بالکل الگ الگ۔ یعنی شعبی بالکل اہلِ حدیث تھے۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ اور ان ہم مشرب تمام فقہائے عراق اور بعض فقہائے مدینہ بھی اگرچہ فتاوے میں قرآن وحدیث پر اعتماد کرتے ہیں، البتہ جن مسائل میں انہوں نے قرآن وحدیث کا کوئی صریح حکم نہیں پایا۔ ان کے استنباط کے لیے انہوں نے انہی مصالح کو سنگِ بنیاد قرار دیا۔ کبار صحابہؓ کی بہترین مثال ان کے سامنے تھی۔ چنانچہ صحابہؓ کے سامنے بہت سے

ایسے مسائل پیش ہوئے جن کے متعلق قرآن و حدیث کی کوئی تصریح موجود نہ تھی۔ تو انھوں نے ان میں قیاس سے کام لیا اور اُن کی یہ آرا انہی مصالح کا لحاظ کرنے کا نتیجہ تھیں۔

اہلُ الرائے پر اہلِ حدیث کا یہ اعتراض تھا کہ وہ اپنے قیاسات کی بنا پر حدیثوں کو چھوڑ دیتے ہیں، لیکن بصیرت سے اگر دیکھا جائے تو یہ ان پر اتہام ہے۔ ہم کو اہلُ الرائے میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا، جس نے اس حدیث پر جو اُس کے نزدیک ثابت ہو گئی ہو قیاس کو ترجیح دی ہو، البتہ بعض اہلُ الرائے ایسے ضرور تھے جن سے یا تو مسئلہ میں کسی حدیث کی روایت ہی نہیں کی گئی یا روایت تو کی گئی، لیکن انہوں نے اس کی سند پر اعتماد نہیں کیا اور اپنی رائے سے فتوے دے دیا۔ اِس لیے یہ فتوے بسا اوقات اس حدیث کے مخالف ہوتا تھا جو اُن کو معلوم نہ تھی یا معلوم تو تھی لیکن انہوں نے اس روایت پر اعتماد نہیں کیا تھا۔ یا ایک حدیث جو اُنکی نگاہ میں اس حدیث سے قوی تر تھی، اس کے مخالف تھی۔

بغیر اس کے کہ ہم فقہائے عراق اور فقہائے حجاز کے درمیان اِس گفتگو پر کسی قسم کا ردّ و قدح کریں، یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ دونوں جب قابلِ اعتماد روایت پا جاتے تھے، تو حدیث کی حد سے آگے قدم نہ بڑھاتے تھے۔

اِس زمانہ میں اور کبار صحابہ رضؓ کے عہد میں حدیث ہی قرآن کی مکمل تفسیر تھی۔ یہ بات بالکل جُدا ہے کہ کبار صحابہ رضؓ کسی مصلحت کے باعث

کتابتِ حدیث یا کثرتِ حدیث یا ہر کس و ناکس کی روایتِ حدیث کو صحیح باور نہ کرتے ہوں۔

اس دَور (صغار صحابہؓ) کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مُفتیوں کے دو فرقے ہو گئے تھے۔ اہلِ حدیث اور اہل الرائے، اِس دَور میں حدیثوں کی بھی بہ کثرت روایت کی جاتی تھی۔ اور تابعین کا ایک گروہ صرف اسی کام میں لگا ہوا تھا، تاہم وہ اب تک کسی مجموعہ کی صورت میں مدوّن نہیں ہوئی تھیں۔

لیکن چونکہ تمام لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حدیثیں قرآن مجید کی وضاحت کر کے دین کی تکمیل کرتی ہیں اور عام مسلمانوں میں کوئی اِس رائے کا مخالف نہ تھا اس لیے عقلاً یہ حالت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

چنانچہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کمی کو محسوس کیا اور اپنے عامل و قاضیِ مدینہ حضرت ابوبکر بن عمرو بن حزام رح کو لکھا کہ رسول اللہ صلعم کی جو حدیثیں ملیں اُن کو لکھو کیونکہ مجھ کو علم اور علماء کے فنا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ امام محمد رح نے امام مالکؒ کے واسطہ سے مؤطا میں یہ روایت کی ہے۔ لیکن ابو نعیمؒ نے تاریخِ اصبہان میں یہ روایت کی ہے کہ انہوں نے تمام ملک کے لوگوں کو لکھا کہ احادیثِ رسول اللہ صلعم کی تلاش کرو اور اُن کو جمع کرو۔

اِس دَور میں محمد بن مسلم بن شہاب زہریؒ نے جو اکابر حفاظِ حدیث میں تھے، حدیث کے لکھنے اور لکھوانے میں اور لوگوں سے خصوصی

امتیاز حاصل کیا۔

اِس دَور کے مشہور علماء، اور مستند مفتی اور محدث سات مقامات مذکورہ تحت پر سکونت پذیر تھے:

مدینہ منورہ۔ مکہ معظمہ۔ کوفہ۔ بصرہ۔ شام۔ مصر۔ یمن۔

مدینہ منورہ میں سترہ مشہور محدث اور مفتی تھے۔

۱۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ، جو تمام ازواجِ مطہرات میں آپؐ کی محبوب ترین بیوی تھیں۔ عطاء بن ابی رباحؒ کا قول ہے کہ "حضرت عائشہ رضؓ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ فقیہہ تھیں۔ انہوں نے رسول اللہ صلعم سے بہت زیادہ حدیثیں روایت کی ہیں۔" چنانچہ مُسند احمد بن حنبل رحؒ میں، ان کا مُسند صفحہ ۲۹ سے ۲۸۲ صفحے تک ہے یعنی ۲۵۴ صفحے میں انہی کی احادیث منقول ہیں۔

فقہائے صحابہ رضؓ انہی کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے بہت سے صحابہ رضؓ اور تابعینؒ نے حدیث کی روایت کی ہے۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ امیرالمومنین عمر بن الخطابؓ کے صاحبزادے تھے۔ اِس درجہ متبع سنت تھے کہ رسول اللہ صلعم جن منزلوں پر اُترے تھے، اور آپؐ نے جہاں جہاں نماز پڑھی تھی، وہ بھی وہاں نماز پڑھتے تھے، یہاں تک کہ آپؐ نے ایک درخت کے نیچے قیام فرمایا تھا تو وہ اس کو پانی دیتے تھے کہ خشک نہ ہونے پائے۔ وہ مسلمانوں کے ائمہ اور مشہور مفتیوں میں سے تھے۔ وہ فتوے اور اپنے نفس کے مرغوبات میں نہایت

محتاط اور دینِ اسلام کے محافظ تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلعم سے بہ کثرت حدیثیں روایت کیں۔ انہوں نے کبار صحابہ رضؓ سے بھی حدیث کی روایت کی۔ اور ان سے بہت سے تابعین نے حدیثیں روایت کیں، جن میں سب سے زیادہ ان کے فرزند سالم اور اُن کے مولیٰ نافع نے روایت کی۔

۳۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد ہجرت کر کے آئے اور تادمِ مرگ آپؐ کی صحبت میں رہے، اور آپؐ سے بہ کثرت حدیثیں روایت کیں اور کبار صحابہ رضؓ سے بھی روایت کی۔ اُن سے بہت سے تابعینؒ نے حدیثیں روایت کیں۔ اُن کے راویوں میں سب سے زیادہ اُن کے داماد حضرت سعید بن المسیبؒ اور ان کے مولیٰ اعرج نے روایت کی اور ان دونوں کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں نے اُن سے روایتیں کیں۔ وہ بہت بڑے عالم اور کبار ائمۂ فتاویٰ میں سے تھے، اسی کے ساتھ بڑے جلیل القدر عبادت گزار اور متواضع و خاکسار تھے اور صحابہ رضؓ میں سب سے زیادہ حافظُ الحدیث تھے۔

۴۔ حضرت سعید بن المسیبؒ المخزومی، خلافتِ فاروقی کے دو سال بعد پیدا ہوئے اور کبار صحابہ رضؓ سے حدیث سُنی۔ نہایت وسیع العلم، نہایت معزز، نہایت دیانت دار، نہایت حق گو اور فرزانہ تھے۔ حضرت ابن عمر رضؓ کا قول ہے کہ "سعید بن المسیبؒ مفتیوں میں سے ایک مفتی ہیں"۔
قتادہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سعید بن المسیبؒ رضؓ سے کسی کو زیادہ عالم نہیں دیکھا۔ علی بن المدینیؒ کہتے ہیں کہ مجھے تابعین میں کوئی ایسا شخص

معلوم نہیں جو سعید بن المسیبؒ سے زیادہ وسیع العلم ہو، وہ میرے نزدیک بزرگ ترین تابعی ہیں۔

۵۔۔۔۔ حضرت عروہ ابن الزبیرؒ، حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں پیدا ہوئے۔ آپ نے بہت سے صحابہ سے حدیثیں روایت کیں، اور اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ وہ سیرت کے عالم اور قابلِ اعتماد حافظِ حدیث تھے۔ ان سے ان کے فرزند ہشام اور ان کے دوسرے لڑکوں نے احادیث کی روایت کی اور زہری، ابو الزناد وغیرہ علمائے مدینہ نے بھی اُن سے روایتیں کیں۔

امام زہریؒ کہتے ہیں کہ میں نے ان کو ایسا دریا پایا جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔

۶۔۔۔۔ ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام۔ یہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں پیدا ہوئے اور اپنے باپ اور دوسرے صحابہؓ سے احادیث کی روایت کی۔ اور ان سے امام زہریؒ اور ان کے علاوہ صغار تابعین نے روایتیں کیں۔ وہ ثقہ، قابلِ استناد، فقیہہ، امام کثیر الروایۃ اور فیاض بزرگ تھے، وہ نیک عبادت گزار باخدا شخص تھے۔ اور ان کو راہبِ قریش کہا جاتا تھا۔

۷۔۔۔۔ حضرت علی بن حسین بن علی بن ابی طالب۔ یہ شیعوں کے اماموں میں چوتھے امام ہیں اور زین العابدین کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے اپنے باپ، اپنے چچا حضرت حسنؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت

ابنِ عباس رضؓ وغیرہ سے روایت کی ہے۔

امام زہری رحؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے علی بن حسینؒ سے زیادہ کسی کو فقیہہ نہیں دیکھا، البتہ وہ قلیل الحدیث تھے۔"

۸ ـــــ حضرت عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعودؓ۔ انہوں نے حضرت عائشہ رضؓ، حضرت ابوہریرہ رضؓ اور حضرت ابنِ عباس رضؓ وغیرہ سے علم حاصل کیا اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحؒ کے اتالیق رہے ہیں۔ امام زہری کا قول ہے کہ عبیداللہ علم کے دریاؤں میں سے ایک دریا تھے۔

۹ ـــــ حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر نے اپنے باپؓ، حضرت عائشہؓ حضرت ابوہریرہ رضؓ، اور حضرت سعید بن المسیبؒ وغیرہ سے حدیث سُنی، اور اُن کے باپ اُن کو نہایت محبوب رکھتے تھے اور اُن کے بارے میں کہتے تھے ؎

یلومونني في سالم والومهم

وجلدة بين العين والانف سالم

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے زہد و فضل میں سلف صالحین کا مثل ان سے زیادہ کوئی نہ تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی روش پر چلتے تھے، اور اُن ہی کی طرح سادہ اور متقشف تھے۔

۱۰ ـــــ حضرت سلیمان بن یسار مولیٰ امّ المومنین میمونہ رضؓ نے حضرت میمونہ رضؓ۔ حضرت عائشہ رضؓ، حضرت ابوہریرہ رضؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابت رضؓ وغیرہ سے روایت کی۔

حسن بن محمد کا قول ہے کہ وہ ہمارے نزدیک سعید بن المسیبؓ سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔

منقول ہے کہ حضرت سعید بن المسیبؒ کے پاس جب کوئی مُستفتی جاتا تھا تو وہ فرمایا کرتے تھے کہ تم کو سلیمان بن یسارؒ کے پاس جانا چاہیئے۔

۱۱ـــــ قاسم بن محمد بن ابی بکر نے اپنی پھوپھی حضرت عائشہ رضؓ، حضرت ابن عباس رضؓ اور حضرت ابن عمر رضؓ وغیرہ سے حدیث سُنی اور اُن کی پھوپھی حضرت عائشہ رضؓ نے ان کی پرورش کی۔

یحییٰ بن سعیدؒ کا قول ہے کہ ہم نے مدینہ میں کسی شخص کو ایسا نہیں پایا جس کو قاسمؒ پر ترجیح دیں۔

ابوالزنادؒ کہتے کہ میں نے کسی فقیہہ کو ان سے زیادہ عالم اور کسی کو ان سے زیادہ حدیث کا ماہر نہیں دیکھا۔ ابن عُیینہؒ کا قول ہے کہ قاسمؒ اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ عالم تھے۔ حضرت عُمر بن عبدالعزیز رضؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا، اگر مجھے خلیفہ بنانے کا اختیار ہوتا، تو قاسمؒ کو خلیفہ بناتا۔

۱۲ـــــ حضرت نافعؒ مولیٰ عبداللہ بن عمر رضؓ۔ انھوں نے اپنے مولیٰ حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ، حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ سے روایت کی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضؓ نے ان کو مصر بھیجا تھا کہ وہاں کے لوگوں کو

حدیث کی تعلیم دیں۔ وہ حضرت سالم کی زندگی میں فتوے نہیں دیتے تھے۔ انھوں نے تیس[۳۰] سال تک حضرت ابنِ عمرؓ کی خدمت کی۔

۱۳۔۔۔۔ محمد بن مسلم معروف بابن شہاب الزہریؒ۔ یہ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت انس بن مالکؓ اور حضرت سعید بن المسیبؒ وغیرہ سے روایتِ حدیث کی۔

لیث بن سعدؒ کا قول ہے کہ میں نے زہریؒ سے زیادہ جامعِ علم کبھی نہیں دیکھا۔ وہ ترغیب کے متعلق حدیث بیان کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ان کے سوا کوئی اس خوبی سے ان حدیثوں کو بیان نہیں کر سکتا۔ اور اگر وہ قرآن وحدیث کے متعلق بیان کرتے ہیں تو اس کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ زہریؒ سے زیادہ گذشتہ حدیثوں کا عالم کوئی باقی نہیں رہا۔

ہشامؒ نے اُن سے خواہش کی کہ اُس کے بعض لڑکوں کو چند حدیثیں لکھوا دیں۔ انھوں نے اُس کو چار حدیثیں لکھوا دیں۔ پھر وہ ایک مہینے کے بعد اُس سے ملے تو اس نے کہا کہ وہ کتاب گم ہوگئی۔ انہوں نے پھر اُس کو وہی حدیثیں لکھوائیں۔ پھر اُس نے پہلی کتاب کا دوسری کتاب سے مقابلہ کیا تو بالکل ہُوبہُو پایا۔ ایک حرف کی بھی کمی یا بیشی نہ تھی۔

امام مالکؒ کا بیان ہے کہ ابنِ شہابؒ مدینہ میں آئے تو ربیعہؒ کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں دفتر میں گئے۔ لیکن جب عصر کے وقت وہاں سے

نکلے تو ابنِ شہاب یہ کہتے ہوئے روانہ ہوئے کہ میرے خیال میں ربیعہؒ کے مثل مدینہ میں نہیں، اور ربیعہؒ یہ کہتے ہوئے چلے کہ میرے خیال میں ابن شہابؒ علم کے جس درجہ کو پہنچ گئے ہیں اُس درجہ کو کوئی نہیں پہنچا۔

ابنِ شہابؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے قاسم بن محمدؒ نے کہا کہ میں تم کو علم کا حریص پاتا ہوں، تو کیا میں تم کو ایک ظرفِ علم کا پتہ بتا دوں؟ میں نے کہا ہاں۔ فرمایا تم کو بنتِ عبدالرحمٰنؒ کے پاس جانا چاہیئے، وہ حضرت عائشہؓ کی پروردۂ آغوش تھیں۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو ایک ایسا دریا پایا جو کبھی خشک نہیں ہوتا۔

۱۴۔۔۔۔ ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین المعروف بالباقرؒ ۔۔۔۔ یہ شیعوں کے پانچویں امام ہیں۔ انہوں نے اپنے باپ اور حضرت جابرؓ اور حضرت ابن عمرؓ وغیرہ سے روایت کی۔ اور وہ اپنے زمانہ میں بنو ہاشم کے سردار تھے۔

۱۵۔۔۔۔ ابو الزناد عبداللہ بن ذکوانؒ فقیہہ مدینہ ۔۔۔۔ انہوں نے حضرت انس بن مالکؓ اور بہت سے صحابہ رضؓ سے حدیث سُنی۔ لیث بن سعدؒ کہتے ہیں کہ میں نے ان کے پیچھے تین سو آدمی دیکھے، جن میں بعض فقہ کے اور بعض شعر وغیرہ کے طالبِ علم تھے، اس کے بعد وہ تنہا رہ گئے، اور یہ سب ربیعۃ الرائے کی طرف بڑھے۔ امام ابو حنیفہ رح فرماتے ہیں کہ میں نے ربیعہؒ اور ابو الزنادؒ دونوں کو دیکھا، لیکن ابو الزنادؒ ان میں زیادہ فقیہہ تھے۔ امام سفیانؒ ابو الزنادؒ کو امیر المومنین فی الحدیث

کہتے تھے۔

۱۶۔۔۔۔ یحییٰ بن سعید انصاریؒ ۔۔۔۔ آپ نے حضرت انسؓ بن مالکؓ اور بہت سے تابعینؒ سے حدیث کی روایت کی۔ یحییٰ قطانؒ کا قول ہے کہ وہ زہریؒ پر مقدم ہیں۔ زہریؒ کے متعلق اختلاف ہے اور ان کے متعلق کوئی اختلاف نہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن سعیدؒ تمام لوگوں میں زیادہ محفوظ و محتاط ہیں۔ وہیبؒ کہتے ہیں کہ میں مدینہ آیا تو بجز یحییٰ بن سعیدؒ اور امام مالکؒ کے کسی ایسے شخص کو نہیں پایا جس کے متعلق بُری بھلی دونوں قسم کی رائیں نہ ہوں۔

۱۷۔۔۔۔ ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن فروخؒ ۔۔۔۔ انہوں نے حضرت انس بن مالکؓ اور بہت سے صحابہؓ سے روایت کی۔ وہ امام، حافظ، فقیہہ، مجتہد اور رائے کے بہت بڑے ماہر تھے۔ اسی بنا پر ان کو ربیعۃ الرائے کہا جاتا تھا۔

یحییٰ بن سعیدؒ کا قول ہے کہ میں نے ربیعہؒ سے زیادہ کسی کو ذہین نہیں دیکھا۔ قاضی سوار بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کو ربیعہ سے زیادہ رائے کا عالم نہیں دیکھا۔

مفتیانِ مکہ معظمہ

۱۔ عبداللہ بن عباسؓ ۔۔۔۔ آپ ہجرت سے دو سال پہلے پیدا ہوئے اور رسول اللہ صلعم نے ان کے لیے یہ دعا کی کہ خدا ان کو دین میں فقیہہ بنائے اور ان کو تاویل سکھلائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ

ابنَ عباؔس رضہ قرآن کے کس قدر بہترین ترجمان ہیں اگر ان کو ہمارا سِنِ وصال ملتا تو ہم میں کوئی اُن کا ہمسر نہ ہوتا۔ معمرؒ کا قول ہے کہ ابنِ عباؔس رضہ کا عام علم تین بزرگوں سے ماخوذ ہے۔ حضرت عمرؔ رضہ، حضرت علیؔ رضہ اور حضرت اُبیؔ بن کعبؓ۔

حضرت ابنِ عبّاس رضہ سے مروی ہے کہ میں جب یہ سُنتا تھا کہ ایک آدمی کے پاس حدیث ہے تو اُس کے پاس آتا تھا اور بیٹھتا تھا، یہاں تک کہ جب وہ نکلتا تھا تو میں اُس سے پوچھتا تھا۔ تفسیر وحدیث میں اہلِ مکّہ کے علم کا دار ومدار حضرت ابنِ عباؔس رضہ ہی پر ہے۔

۲۔۔۔۔ مجاہدؔ بن جبیر مولیٰ ابنِ مخزومؒ ۔۔۔۔ آپ نے حضرت سعدؔ رضہ، حضرت عائشہ رضہ، حضرت ابوہریرہ رضہ وغیرہ سے حدیث سُنی۔ حضرت ابنِ عباس رضہ کی خدمت میں ایک مدّت تک رہے اور ان سے علمِ قرآن حاصل کیا۔ وہ علم کے ظروف میں سے ایک ظرف تھے۔ خود اُن کا قول ہے کہ میں نے ابنِ عباؔس کو تین مرتبہ قرآن سُنایا اور ان کے سامنے ہر آیت پر ٹھہرتا رہا اور پُوچھتا رہا کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی؟ اور اس کا کیا واقعہ ہے؟۔۔۔ قتاؔدہ رحہ کا قول ہے کہ جو علماء رہ گئے ہیں، اُن میں تفسیر کے سب سے بڑے عالم مجاہدؔ ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ بعض اوقات ابنِ عمرؔ رضہ نے میرا رکاب تھاما۔

۳۔۔۔۔ حضرت عکرمہ مولیٰ ابنِ عباسؓ ۔۔۔۔ انہوں نے حضرت ابنَ عباسؓ، حضرت عائشہ رضہ اور حضرت ابوہریرہ رضہ وغیرہ سے حدیث کی روایت کی اور

حضرت ابنِ عبّاس رضہ سے فقہ کی تعلیم پائی۔ حضرت سعید بن جبیرؒ سے کہا گیا کہ آپ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں، جو آپ سے بھی زیادہ عالم ہو؟ فرمایا، ہاں۔ عکرمہؒ۔

اِن پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ خارجیوں کے ہمراہ تھے۔ اِس بنا پر امام مالکؒ اور امام مسلمؒ نے ان سے روایتِ حدیث نہیں کی۔

۴ ــــ حضرت عطاء بنِ ابی رباح مولیٰ قریشؒ ــــ یہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں پیدا ہوئے اور حضرت عائشہ رضہ حضرت ابوہریرہ رضہ اور حضرت ابنِ عبّاس رضہ وغیرہ سے حدیث سُنی۔ امام ابوحنیفہؒ کا قول ہے کہ میں نے عطاءؒ سے زیادہ کسی کو افضل نہیں دیکھا۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ عطاءؒ مرنے کے دن مرتے تو اہلِ زمین میں لوگوں کے نزدیک زیادہ پسندیدہ تھے۔ اسماعیل بن امیہؒ کہتے ہیں کہ عطاءؒ بہت دیر تک خاموش رہتے تھے، لیکن جب بولتے تھے تو ہم کو معلوم ہوتا تھا کہ خُدا کی جانب سے ان کی تائید کی جاتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضہ نے فرمایا کہ اے اہلِ مکہ تم میرے پاس جمع ہوتے ہو، حالانکہ تمہارے یہاں عطاءؒ ہیں۔

۵ ــــ حضرت ابوالزبیر محمد بن مسلم بن مدرس مولیٰ حکیم بن حزام ــــ حضرت ابنِ عبّاس رضہ۔ حضرت ابنِ عمر رضہ اور حضرت سعید بن جبیرؓ وغیرہ سے روایت کی۔

یعلیٰ بن عطاءؒ کا قول ہے کہ ہم سے ابوالزبیرؒ نے حدیث بیان کی اور وہ لوگوں میں باعتبارِ عقل سب سے زیادہ حافظ تھے۔ عطاءؒ کہتے ہیں کہ

ہم حضرت جابر رضؓ کے پاس ہوتے تھے اور وہ ہم سے حدیث بیان کرتے تھے۔ پھر جب ہم وہاں سے نکلتے تھے تو باہم مذاکرہ کرتے تھے، اور اس حالت میں ابو الزبیرؒ ہم میں سب سے زیادہ حافظ الحدیث ہوتے تھے۔

مُفتیانِ کوفہ

۱ ــــ حضرت علقمہ بن قیس النخعیؒ، فقیہہ عراق ــــ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پیدا ہوئے اور حضرت عمر رضؓ، حضرت عثمان رضؓ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے حدیث سُنی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے فقہ کی تعلیم پائی اور وہ اُنکے برگزیدہ ترین اصحاب میں سے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت ہے کہ میں کوئی ایسی چیز نہیں پڑھتا اور ایسی چیز نہیں جانتا جس کو علقمہؒ نہ پڑھتے ہوں یا نہ جانتے ہوں۔

امام ذہبیؒ کہتے ہیں کہ وہ فقیہ امام فائق تھے۔ قرآن نہایت خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ عبور روایت میں محتاط اور مُستند اور نیک اور پرہیز گار تھے۔ طرز و روش وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے مشابہ تھے۔

۲ ــــ حضرت مسروق بن الاجدعؒ الہمدانی الفقیہہؒ ــــ

یہ عمرو بن معدی کربؓ کے بھانجے ہیں اور حضرت عمر رضؓ، حضرت علی رضؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ سے روایت کی ہے۔ امام شعبیؒ کا قول ہے کہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو مسروق رحؒ سے زیادہ علم کا طلب گار ہو، یہ

شریح رہ سے زیادہ فتوے کے عالم تھے۔ شریحؒ اُن سے مشورہ کرتے تھے، اور مسروقؒ، شریحؒ کے محتاج نہ تھے۔

۳ــــــ حضرت عبیدہ بن عمرو السلمانی المرادیؒ ــــــ

فتح مکہ کے زمانہ میں یمن میں اسلام لائے اور حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے علم حاصل کیا۔ امام شعبی رہ فرماتے ہیں کہ فقہا میں وہ شریحؒ کے مدمقابل تھے۔ عجلیؒ کا قول ہے کہ عبیدہؒ، حضرت عبداللہ بن مسعودرضؓ کے اُن اصحاب میں سے ہیں جو لوگوں کو پڑھاتے تھے اور لوگوں کو فتوے دیتے تھے۔

۴ــــــ حضرت اسود بن یزید النخعیؒ ــــــ

کوفہ کے عالم اور علقمہ بن قیسؒ کے بھتیجے ہیں۔ حضرت معاذ رضؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ وغیرہ سے علم حاصل کیا۔

۵ــــــ حضرت شریح بن الحارث الکندیؒ ــــــ

حضرت عمرضؓ نے اِن کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا اور اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے دوسرے خلفاء نے ان کو قاضی بنایا۔ وہ حجاج بن یوسفؒ کے زمانہ تک قاضی رہے۔ اپنی موت سے ایک سال پہلے انھوں نے اِس عہدے سے استعفار دے دیا۔ پورے ساٹھ سال تک مسلسل قاضی رہے۔

حضرت عمر رضؓ اور حضرت علی رضؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایات بیان فرمائیں۔

۶ ـــــ حضرت ابراہیم بن یزید النخعیؒ فقیہہ العراق ـــــ

علقمہؒ، مسروقؒ اور اسودؒ وغیرہ سے روایت کی اور یہ حماد بن ابی سلیمانؒ فقیہہ کے شیخ ہیں اور مخلص علماء میں سے تھے۔ شہرت سے بچتے تھے۔ عبدالملک بن ابی سلیمانؒ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیرؒ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ "تم لوگ مجھ سے فتوے لیتے ہو، حالانکہ تم میں ابراہیم نخعیؒ موجود ہیں۔

۷ ـــــ حضرت سعید بن جبیرؒ ـــــ

حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ وغیرہ سے حدیث سُنی۔ جب اہلِ کوفہ حج کو جاتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مسئلہ پوچھتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ کیا تم میں سعید بن جبیرؒ نہیں؟ وہ کسی کو اپنے پاس غیبت کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

میمون بن مہرانؒ کہتے ہیں کہ سعید بن جبیرؒ کی وفات ہوئی تو روئے زمین پر کوئی ایسا آدمی نہ تھا جو اُن کے علم کا محتاج نہ ہو۔

۸ ـــــ حضرت عامر بن شراحیل الشعبیؒ، علامۃ التابعین ـــــ

۱۷ھ حضرت عمر رضؓ کے دَورِ خلافت میں پیدا ہوئے۔ یہ امام، حافظ، فقیہہ اور مختلف علوم کے حامل تھے۔ حضرت علی رضؓ۔ حضرت ابوہریرہؓ حضرت ابنِ عباس رضؓ۔ حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عمر رضؓ وغیرہ سے روایت کی ـــــ

امام ابوحنیفہ رحؒ کے سب سے بڑے شیخ ہیں اور کوفہ کے قاضی رہ

چکے ہیں۔ مکحولؒ کہتے ہیں کہ "میں نے شعبیؒ سے بڑھ کر عالم نہیں دیکھا۔"
ابوحصینؒ کا قول ہے کہ "میں نے شعبیؒ سے زیادہ فقیہہ نہیں دیکھا۔"
ابن سیرینؒ نے ابوبکر الہذلیؒ سے کہا کہ "شعبیؒ کی صحبت کو لازم پکڑلو، کیونکہ میں نے ان کو دیکھا کہ ان سے فتوےٰ لیا جاتا تھا حالانکہ بکثرت صحابہؓ اُس وقت موجود تھے۔"
ابن ابی لیلیٰؒ کہتے ہیں کہ "شعبیؒ صاحبِ آثار (یعنی صاحبِ حدیث) اور ابراہیمؒ صاحبِ قیاس تھے۔"

مُفتیانِ بصرہ

۱ــــ حضرت انس بن مالک انصاریؓ
خادمِ رسول اللہ صلعم مدتوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے۔ ان سے بکثرت حدیثیں مروی ہیں، یہ ابتدائے ہجرت سے تادم مرگ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں رہے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت ابیؓ سے علم حاصل کیا اور بہت دنوں تک زندہ رہے۔

۲ــــ حضرت ابوالعالیہ رفیع بن مہرانؒ ــــ
حضرت عمرؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ سے احادیث سُنیں۔

۳ــــ حضرت حسن بن ابی الحسن یسارؒ مولیٰ زید بن ثابتؓ ــــ
مدینہ میں پیدا ہوئے اور حضرتِ عثمانؓ کے دَورِ خلافت میں قرآن حفظ کیا اور بہت سے صحابہؓ سے حدیث کی روایت کی۔

ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ "وہ بلند مرتبہ، مستند عالم، محفوظ، عبادت گزار، بڑے علم والے، فصیح وجیہہ خوب صورت تھے۔ وہ اُن حق گو لوگوں میں سے تھے جو اعلاءِ کلمۃ اللہ کے بارے میں لومۃ لائم کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

۴ ــــــ حضرت ابوالشعثاء جابر بن زیدؒ، صاحب ابنِ عباس رضؓ ــــــ

حضرت ابنِ عباس رضؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ "اگر اہلِ بصرہ جابر بن زیدؒ کے قول کو تسلیم کرتے تو وہ ان چیزوں کے متعلق جو کتاب اللہ میں ہیں، اُن کے علم کو وسیع کر دیتے۔" اُن سے یہ بھی مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ تم مجھ سے پوچھتے ہو، حالانکہ تم میں جابر بن زیدؒ موجود ہیں۔

۵ ــــــ محمد بن سیرینؒ، مولیٰ انس بن مالک رضؓ ــــــ

حضرت عثمان رضؓ کی خلافت کے دو سال باقی رہ گئے تھے کہ یہ پیدا ہوئے۔ اپنے مولیٰ حضرت انس رضؓ، حضرت ابوہریرہ رضؓ، حضرت ابنِ عباس رضؓ اور حضرت ابنِ عمر رضؓ وغیرہ سے روایت کی۔ یہ فقیہہ امام وسیع العلم مستند، بہت بڑے معبّرِ خواب اور نہایت پرہیزگار تھے۔

۶ ــــــ قتادہ بن دعامہؒ ــــــ

حضرت انس رضؓ اور حضرت سعید بن المسیبؒ وغیرہ سے روایت کی، یہ نابینا اور قوی الحافظہ تھے۔ ابن سیرینؒ کہتے ہیں کہ "قتادہؒ لوگوں میں سب سے زیادہ حافظ تھے"۔ امام احمد بن حنبلؒ نے نہایت طوالت سے ان کا

ذکر کیا اور کہا کہ "ایسے بہت کم لوگ ملیں گے جو ان پر ترجیح رکھتے ہوں"۔

مُفتیانِ شام

۱۔ حضرت عبدالرحمٰن بن غنم الاشعریؒ

حضرت عمرؓ اور حضرت معاویہؓ وغیرہ سے روایت کی اور حضرت عمر بن الخطابؓ نے ان لوگوں کو فقہ سکھانے کے لیے شام بھیجا اور شام کے تابعین نے انھیں سے فقہ کی تعلیم پائی۔

۲۔ ابوادریس الخولانی عائذ اللہ بن عبداللہؒ

یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو علم و عمل دونوں کے جامع تھے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ اور بہت سے صحابہؓ سے علم حاصل کیا۔ یہ اہلِ دمشق کے واعظ اور قاضی تھے۔

۳۔ قبیصہ بن ذویبؒ

خلیفہ عبدالملک کے مہر بردار تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ وغیرہ سے روایت کی۔ امام زہریؒ کہتے ہیں کہ "قبیصہ اس اُمت کے علماء میں سے تھے"۔

امام شعبیؒ سے مروی ہے کہ "قبیصہؒ لوگوں میں حضرت زید بن ثابتؓ کے فیصلوں کے سب سے بڑے عالم تھے"۔

۴۔ مکحول بن ابی مسلمؒ

قبیلۂ ہذیل کی ایک عورت کے مولیٰ تھے۔ صغار صحابہؓ سے روایت کی اور کبار صحابہؓ کے متعلق تدلیس کرتے تھے۔ طلبِ حدیث میں نہایت کثرت

سے سفر کیا اور بہت زیادہ علم حاصل کیا۔

۵ ـــــ رجاء بن حیوۃ الکندیؒ ـــــ

اہلِ شام کے شیخ اور عمائدِ سلطنت میں داخل تھے۔ امیر معاویہؓ، حضرت عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت جابرؓ وغیرہ سے روایت کی۔ ابن سعدؒ کا قول ہے کہ "رجاءؒ فاضل، مستند اور بہت زیادہ علم والے تھے۔"

۶ ـــــ عمر بن عبدالعزیزؒ ـــــ

یہ بنو امیہ کے آٹھویں خلیفہ ہیں۔ مدینہ میں پیدا ہوئے اور مصر میں نشو و نما پائی۔ اور حضرت انس بن مالکؓ نیز بہت سے تابعینؒ سے روایت کی۔ یہ امام، فقیہہ، مجتہد، ماہرِ حدیث، معزز، مستند، حجت، حافظ، مطیعِ خدا، اَوّاہ اور منیب تھے۔ عدل و انصاف اور احساسِ ذمہ داری میں حضرت عمر بن الخطابؓ کے مثل اور زہد میں حضرت حسن بصریؒ کی نظیر اور علم میں امام زہریؒ کے ہمسر تسلیم کیے جاتے تھے۔

مفتیانِ مصر

۱ ـــــ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ ـــــ

یہ عہدِ نبوی ہی سے بڑے روزہ دار، بڑے نماز گزار، قاریِ قرآن اور بڑے جویائے علم تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلعم سے سُن کر بہت سی حدیثیں لکھیں اور حضرت ابوہریرہؓ ان کی کثرتِ حدیث کے معترف تھے۔

۲ ـــــ ابوالخیر مرشد بن عبداللہ الیزنیؒ ـــــ

حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت عقبہ

بن عامر رضؓ سے روایت کی اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے فقہ حاصل کیا۔

۳ ــــــ یزید بن ابی حبیبؒ ــــــ

اگرچہ بعض صحابہؓ سے بھی روایت کی ہے۔ لیکن ان کی اکثر روایتیں تابعینؒ سے ہیں۔ ابوسعید بن یونسؒ کہتے ہیں کہ وہ اہلِ مصر کے مفتی تھے، وہ حلیم و عاقل تھے اور سب سے پہلے انہیں نے مصر میں علمی مسائل کو پھیلایا، اور حلال و حرام کو ظاہر کیا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے مصر میں افتاء کی خدمت سپرد کی تھی۔

مُفتیانِ یمن

۱ ــــــ طاؤس بن کیسان الجندیؒ ــــــ

حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہ رضؓ وغیرہ سے حدیث سُنی۔ علم و عمل میں منتخب روزگار تھے۔ عمرو بن دینارؒ کہتے ہیں کہ "میں نے کسی کو طاؤسؒ کے مثل نہیں دیکھا" قیس بن سعدؒ کہتے ہیں کہ "طاؤسؒ ہم میں ایسے ہی تھے جیسے بصرہ والوں میں ابن سیرینؒ"۔ ذہبیؒ کہتے ہیں کہ "طاؤسؒ اہلِ یمن کے شیخ اُن کے فقیہہ اور ان کے لیے ایک برکت تھے۔ بڑے جلیل القدر تھے، حج بہت کرتے تھے"۔

۲ ــــــ وہب بن منبہؒ ــــــ

اہلِ یمن کے عالم ہیں۔ حضرت ابن عمر رضؓ، حضرت ابن عباس رضؓ اور حضرت جابر رضؓ وغیرہ سے روایت کی۔ عجلیؒ کہتے ہیں کہ "وہ مستند تابعی اور قاضی تھے"۔

۳ ــــــ یحییٰ بن ابی کثیرؒ ــــــ

حضرت انس بن مالکؓ اور بہت سے تابعینؒ سے روایت کی۔

شعبہؒ کہتے ہیں کہ وہ حدیث میں زہریؒ سے اچھے ہیں۔

احمدؒ کہتے ہیں کہ جب زہریؒ ان کی مخالفت کریں تو یحییٰ کا قول تسلیم کیا جائے گا۔

جو لوگ اس دور میں فتوای دیتے تھے اور روایتِ حدیث کرتے تھے ان میں بزرگ ترین یہی لوگ تھے۔ جن کا ہم نے مختصراً تعارف کرایا ہے۔

دوسری صدی ہجری علمِ حدیث کے لیے ایک بہترین دور تھا کیونکہ اس میں رواۃِ حدیث نے اس کی تصنیف و تدوین کی ضرورت کو محسوس کیا' اور تصنیف کا مطلب یہ تھا کہ ایک ہی قسم کی حدیثوں مثلاً نماز اور روزے وغیرہ کی حدیثوں کو باہم ایک ہی سلسلے میں جوڑ دیا جائے۔ یہ خیال تمام اسلامی شہروں میں قریب قریب ایک ہی زمانہ میں پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تقدم کا شرف کس کو حاصل ہے۔ لیکن اس دور کے مدوّنین میں مدینہ میں امام مالک بن انسؒ۔ مکہ میں عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریجؒ۔ کوفہ میں سفیانؒ ثوریؒ' بصرہ میں حماد بن سلمہؒ اور سعید بن ابی عروہؒ واسط میں ہشیم بن بشیرؒ' شام میں عبدالرحمٰن اوزاعیؒ' یمن میں معمر بن راشدؒ' خراسان میں عبداللہ بن مبارکؒ اور رَے میں جریر بن عبدالحمیدؒ تھے' اور یہ کچھ اوپر ۱۴۰ھ کا زمانہ تھا اور ان کتابوں میں حدیث' جیسا کہ ہم کو مؤطا امام مالکؒ میں نظر آتا ہے۔ صحابہؓ اور تابعین کے اقوا[illegible] ساتھ مخلوط تھی۔ لیکن اِن لوگوں

کے بعد دوسری صدی کے آغاز میں، دوسرے طبقہ کے لوگوں نے رسول اللہ صلعم کی احادیث کو صحابہ کرامؓ اور اکابرین عظامؒ کے اقوال سے الگ کرنا مناسب سمجھا اور وہ کتابیں تالیف کیں جو مسانید کے نام سے مشہور ہیں۔ مثلاً مُسند عبداللہ بن موسیٰ کوفیؒ، مُسند مسدد بن مسرہد البصریؒ، مُسند اسد بن موسیٰ المدنیؒ، مُسند نعیم بن حماد الخزاعیؒ۔ مُسند اسحاق بن راہویہؒ۔ مُسند عثمان بن ابی شیبہؒ اور مُسند امام احمد بن حنبلؒ۔ اِن لوگوں نے احادیث کو ان کے راویوں کے مسانید میں درج کیا۔ مثلاً مُسندِ ابوبکر صدیقؓ کا ذکر کرتے ہیں، تو اُس میں ان تمام روایتوں کو درج کرتے ہیں جو اُن سے مروی ہیں۔ اس کے بعد اسی طرح ایک ایک صحابی کا ذکر کرتے ہیں اور ان تمام مسانید میں ہم تک صرف مُسندِ امام احمد بن حنبلؒ پہنچ سکا ہے۔

اِس طبقہ کے بعد دوسرا طبقہ پیدا ہوا اور اس نے اپنے سامنے اس عظیم الشان ذخیرہ کو دیکھا تو اس نے اپنے لیے انتخاب کا دروازہ کھولا، اور اس طبقہ کے سرخیل امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاریؒ اور امام مسلم بن الحجاج النیشاپوریؒ ہیں، جنھوں نے روایت و انتخاب میں نہایت چھان بین کرنے کے بعد اپنی صحیحین کو تصنیف کیا ہے اِس لیے اس معاملہ میں وہ انتہائی درجہ کو پہنچ گئے ہیں۔ ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانیؒ، ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذیؒ، ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینی المعروف بابن ماجہؒ اور ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائیؒ نے بھی انہی کی تقلید کی ہے، اور علماء کی زبان پر ان کی کتابیں "کتب ستہ" کے نام سے مشہور ہیں۔

اور چونکہ ان میں بالخصوص بخاریؒ و مسلمؒ کے رواۃ نہایت مستند ہیں، اس لیے اِن کتابوں نے مسلمانوں میں عظیم الشان اعتبار کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ لیکن صرف انہی لوگوں نے حدیث میں کتابیں تصنیف نہیں کیں بلکہ ان میں پہلو بہ پہلو بہت سے لوگ اور بھی ہیں، لیکن جو شہرت اِن لوگوں کو حاصل ہوئی، وہ اور لوگوں کو حاصل نہ ہو سکی۔

اس دَور کے لوگوں میں کچھ لوگ اور تھے جن کا مطمحِ نظر یہ تھا، کہ تابعینؒ اور تابعینؒ کے بعد جو رواۃ حدیث ہیں، ان کی حالت سے بحث کریں اور ان لوگوں میں سے ہر شخص کے ضبط، اتقان، عدالت یا ان کے خلاف اوصاف کو بیان کر دیں۔ یہ لوگ اہلِ جرح و تعدیل کے نام سے مشہور ہیں۔

ان گزشتہ اَدوار میں حدیث ایک بُنیادی اصول خیال کی جاتی تھی۔ جب قرآن پاک کی کوئی نص نہیں پاتے تھے تو حدیث ہی کیطرف رجوع کرتے تھے اور احادیث کو مکمل تشریحِ قرآنی سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ امام شافعی رح کا زمانہ آیا۔ تب منکرینِ حدیث کا ظہور ہوا۔ چنانچہ امام شافعی رح نے "کتابُ الاُمّ" کی ساتویں جلد میں ایک باب باندھا، اور منکرینِ حدیث کا رَدّ کیا اور مستقل رسالہ بھی لکھا۔ لیکن اصحابِ حدیث کی قوت سے ٹکرا کر یہ رائے نمایاں نہ ہونے پائی اور قرآن کے بعد حدیث پر اعتماد کرنے کا مذہب غالب رہا۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اگر حدیث کی ضرورت نہیں، اور حدیث

مکملِ قرآن نہیں تو آنحضرت صلعم سے لے کر آج تک خلفائے راشدینؓ تابعینؒ، کبار صحابہؓ اور صغار صحابہؓ، مفتیانِ امصارؒ، ائمہ مجتہدینؒ کیوں اپنی جانیں کھپاتے رہے اور سب کے سب اپنے استنباطات اور اجتہادات میں قرآن پاک کے بعد احادیث اور اقوالِ نبیؐ کی تقلید و اتّباع کیوں کرتے رہے ہیں؟

اگر اسلام کے اِن نئے محسنوں " (منکرینِ حدیث) کے خیالات مان لیے جائیں تو لازم آئے گا کہ یہ سب کے سب نعوذ باللہ مشرک، انسان پرست، کتابُ اللہ کے تارک تھے اور آج جو نئے مُفسّر نئے فقیہہ بنے ہیں ان کے اقوال و اجتہادات و استنباطات کے سُننے والے سچّے موحّد، سچّے دیندار اور کتابُ اللہ کے سچّے پیرو ثابت ہوں، تو نعوذ باللہ آنحضرت صلعم کا دین سخت ناکام رہا اور تیرہ سو برس تک اسی طرح ناکام رہا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک قطعۂ زمین میں کتابُ اللہ کے چند ماہرینِ اسرار پیدا ہوئے اور انھوں نے اصلی اسلام کو دنیا میں آشکارا کیا اور وہ کام کیا جو نہ خود رسول اللہؐ نے، نہ ابوبکر صدیق رضؓ نے کیا۔ نہ عمر فاروق رضؓ نے کیا، نہ علی رضؓ نے، نہ دوسرے صحابہؓ اور تابعینؒ نے اور نہ دوسرے ائمہ مجتہدینؒ سے ہو سکا۔ پھر ہمیں کوئی بتلائے کہ قرآن کی عملی تصویر دنیا میں کبھی جلوہ گر تھی یا نہیں؟ اگر تھی، تو کب اور کس لباس میں اور اس کی تاریخ کہاں سے ملے گی؟ اور اگر نہ تھی تو قرآن سے زیادہ ناکام صحیفۂ آسمانی دُنیا میں اور کونسا ہوگا؟ کیا کسی مسلمان کی غیرت

اسلامی اِس خیال کو جائز رکھتی ہے؟ اور اگر نہیں رکھتی، اور نہیں رکھ سکتی تو **ھٰذا الا ھذیان او بھتان عظیم**

اگر احادیث کا یہ سارا ذخیرہ بے اعتبار اور مصنوعی اور بناوٹی ہے تو میں منکرینِ حدیث سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا امام مالکؒ نے موطا میں بزعم منکرین نقل در روایاتِ حدیث میں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا پردازیاں کیں اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرام رضؓ کی طرف جھوٹی جھوٹی باتیں منسوب کیں۔ اسلام کے عین مرکز میں اور اس سرزمین میں جہاں رسولِ کریم علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم آرام فرما ہیں اور وہاں بھی خاص اس مسجدِ حرم میں جو دس برس تک درس گاہِ نبوت اور سجدہ گاہِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رہ چکی ہو، امام مالکؒ نے ان مفتریات واکاذیب کے مجموعہ کا درس دینا شروع کیا اور اس درس میں آندلس، مصر، شام، کوفہ، بصرہ اور بلادِ عجم تک کے علماء شریک ہوئے اور اس مجموعہ کی روایت وسماع بلکہ ان کی نقلیں حاصل کرکے اطرافِ عالم میں پھیل گئے اور اس مجموعہ کو دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا تو اسوقت کوئی ہمدردِ اسلام، کوئی حقیقی مسلمان بلکہ کوئی غیرت مند مسلمان ایسا نہ تھا، جو امام مالکؒ کی اِس نازیبا کارروائی کے خلاف لب کشائی کرنیکی جرأت کرتا اور مسلمانوں کو اُن کے فریب سے بچاتا اور ان افترا پردازیوں کی روک تھام کرتا۔ درصورتیکہ یہ روک تھام و افترا پردازیوں کی پردہ دری کچھ مشکل بھی نہ تھی، اِس لیے کہ امام مالکؒ نے موطا میں جو روایتیں کی ہیں

ان کی نسبت یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ انہوں نے ان کو فلاں فلاں علماء سے سُنا ہے اور تصنیفِ مؤطّا کے وقت ان میں بہت سے علماء بقیدِ حیات موجود تھے۔ لہٰذا امام مالکؒ کے خلاف ان علماء کی شہادتیں حاصل کر کے امام مالکؒ کی غلط بیانیوں کا راز نہایت آسانی سے فاش کیا جا سکتا تھا۔ لیکن کسی نے ایسا نہ کیا۔ ایک آواز بھی امام مالکؒ کی مخالفت میں نہ آئی۔ کسی عالم نے بھی ان کو افترا پرداز اور غلط گو نہ کہا۔ ممکن ہے کہ منکرینِ حدیث بول اٹھیں کہ مؤطّا کی تصنیف حکومت کی سرپرستی میں ہوئی ہے' اس لیے حکومت کے خوف سے کوئی نہیں بولا۔ لیکن یہ کہنا جہالت کا بدترین نمونہ ہوگا۔ اِس لیے کہ تاریخیں شاہد ہیں کہ اس زمانے کے اہلِ علم حکومتوں کے خوف سے حق گوئی سے کبھی باز نہ رہتے تھے۔ امام احمدؒ بلکہ خود امام مالکؒ کے حالاتِ زندگی پڑھنے سے یہ امر بخوبی معلوم ہو سکتا ہے اور ان بزرگوں کے سوانح اس شُبہ کی مزیل بن سکتی ہیں۔

علاوہ بریں یہ ہے کہ یہ بالکل تاریخی بات ہے اور تاریخوں میں بسرپرستی حکومت مؤطّا کے تصنیف ہونے کا کوئی ضعیف سے ضعیف ثبوت بھی نہیں، بلکہ اس کے برخلاف تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔

اِس جماعت کی (بقول منکرین مصنوعی ذخیرہ گھڑنے والوں کی تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ) حدیث کے ادب کی یہ

حالت تھی کہ امام مالکؒ کے پاس اگر کوئی حدیث سُننے کے ارادہ سے آتا تھا تو امام صاحبؒ غسل کرتے اور عمدہ کپڑے پہن کر باہر آتے اور نہایت ادب کے ساتھ حدیث سُناتے۔

ایک مرتبہ بچھو کپڑوں میں گھس گیا اور درسِ حدیث کے دَوران میں اُس نے متعدد بار ڈنک مارا۔ جس کی وجہ سے امام صاحب رح سخت بے چین تھے اور تکلیف کی وجہ سے چہرہ کا رنگ بدل بدل جاتا تھا۔ مگر ادب کی وجہ سے حدیث کو درمیان میں قطع نہ کیا' اور لب و لہجہ میں تغیّر نہ آنے دیا۔ حدیث کو پورا کر کے کپڑوں کو اُتارا۔

امام مالکؒ کی احترام اور عظمتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ کیفیت تھی کہ تمام عمر مدینۂ طیبہ میں سواری پر سوار نہ ہوتے۔ اور فرماتے' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس زمین پر حضور صلعم کے قدم پڑے ہوں میں اُس پر جانور کا قدم رکھوں؟ بول و براز کے لیے شہر کے باہر جاتے' کبھی حَدِ حرم میں قضاءِ حاجت نہیں کی۔ (بستان المحدثین)

ناظرین نظرِ انصاف سے فیصلہ کر لیں کہ یہ حضرات جن کی کیفیت یہ ہو' کیا حدیث میں کچھ خلط ملط کر سکتے ہیں؟

امام بخاری رح نے چھ لاکھ حدیثوں سے چھانٹ کر کتاب صحیح بخاری مرتب کی جو اِس وقت موجود ہے۔ ایک ایک حدیث کو غسل کر کے اور دو رکعت نمازِ استخارہ پڑھ کر لکھا۔ سولہ سال میں یہ کتاب تیار ہوئی حضرت

امام کی یہ کیفیت تھی۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن غیبت کے متعلق مجھ سے سوال نہ ہوگا۔ کیونکہ میں نے کبھی کسی کی غیبت نہیں کی۔ (بستان)

امام مسلم رح نے تین لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کر کے صحیح مسلم لکھی۔ انہوں نے جو شرطیں روایتِ حدیث کے متعلق اپنی کتاب میں ملحوظ رکھی ہیں، امام بخاری کی شرطوں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

ان کی خصوصیت میں سے ہے کہ انہوں نے تمام عمر نہ کسی کی غیبت کی نہ کسی کو مارا نہ برا بھلا کہا۔ (بستان)

ابو داؤد سجستانی رح نے پانچ لاکھ حدیثوں سے چھانٹ کر اپنی کتاب سننِ ابی داؤد بنائی۔ جس میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں ہیں یہ عبادت اور زہد و تقوے میں ضرب المثل تھے۔

ایک محدث امام ترمذی رح تھے۔ ان کی مشہور کتاب "جامع ترمذی" ہے، ان کی ذہانت اور حافظہ کے واقعات فن کی کتابوں میں بکثرت منقول ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب ترمذی بڑی احتیاط سے لکھ کر پہلے علماءِ حجاز کی خدمت میں پیش کی، ان سب نے پسند کی۔ بعد ازاں اس کو میں علمائے عراق کے پاس لے گیا۔ انہوں نے بھی متفق اللفظ ہو کر بہت تعریف کی۔ اس کے بعد علماءِ خراسان کو دکھائی، انہوں نے بھی پسند کی۔

امام ترمذی کا ورع و تقویٰ بھی ضرب المثل ہے۔ خدا کے خوف

سے اس قدر روئے کہ نابینا ہو گئے۔ (بستان المحدثین)

کیا ایسے حضرات جن کے اوصاف تحریر میں آئے، اور آئندہ بھی درج ہوں گے، حدیث میں گڑبڑ کر سکتے ہیں۔ حاشا وکلاّ حقیقت یہ ہے کہ خوشبودار مکان سے ہمیشہ خوشبو اور بدبودار سے بدبُو ہی نکلا کرتی ہے۔ اولٰئِكَ اٰبائی فجئنی بمثلھم

پھر میں اِن منکرینِ حدیث سے پوچھتا ہوں کہ اگر دوسری صدی کے نصفِ اوّل ہی میں (معاذ اللہ) مسلمانوں کی بے دینی و بے حمیتی اور اُن کی ایمانی و اخلاقی کمزوری کا یہ حال ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلعم پر کچھ مسلمانوں نے افترا پردازیاں کیں اور پے در پے کرتے رہے اور کتابُ اللہ کے تارک بنے اور مسلمانوں کو قرآنِ کریم اور اس کی تعلیمات سے بے توجہ، بے پروا اور ناواقف بنانے کی تدابیر عمل میں لاتے رہے اور دینِ قیّم میں ہزاروں لایعنی باتیں، ہزاروں خلافِ قرآن عقائد و اعمال اور ہزاروں خلافِ عقل و دُور از کار افسانے داخل کرتے رہے اور ذاتِ نبوّت پر سینکڑوں ناجائز اور غیر معتبر اقوال و افعال تراشتے رہے اور سارے مسلمانانِ عالم اِن شرمناک حرکات کا خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے۔ کسی نے اِن مفتریوں کے مقابلے میں اپنی ایمانی و اخلاقی جرأت سے کام نہ لیا۔ اور کوئی رسول اللہ صلعم کی عزّت و ناموس کی حفاظت اور قرآنِ کریم کی حمایت کے لیے کھڑا نہیں ہوا اور شریعتِ مطہرہ میں اِس قدر تحریفات ہوتے دیکھ کر بھی کسی کی رگِ حمیت نہ پھڑکی۔ تو اگر کوئی غیر مُسلم آپ سے

پوچھے کہ جب خیر القرون کے مسلمانوں کا یہ حال تھا، تو کیا اطمینان ہے کہ قرآنِ کریم بھی اِن نارواتصرفات سے سالم رہا ہوگا۔ اور کیا توقع ہے کہ مسلمانوں نے اس کو بجنسہٖ محفوظ رکھنے کے لیے بھی کوشش کی ہوگی؟ منکرینِ حدیث بتائیں کہ اس غیر مسلم کو وہ کیا جواب دیں گے ؟

ایسی چیزوں کے انکار اور ایسے منقدہ اخبار کو بے اعتبار کر دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے ہاتھوں سے قرآنِ کریم بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن بھی چھوٹ جائے گا۔ اس لیے کہ ان سب چیزوں کا مدار معتبر اخبار کے سوا اور کسی چیز پر نہیں ہے۔

میں ہر چند غور کرتا ہوں، لیکن کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ منکرینِ حدیث کو عقل و خرد سے اتنی بے گانگی کیوں ہے؟ آخر یہ کس عقل کا تقاضا ہے کہ کتبِ احادیث میں جو اقوال و افعالِ نبوی آنحضرت سے لے کر اِن کتابوں کے مصنفین تک مسلسل راویوں کے بیانات اور شہادت کے ذریعہ منقول ہوتے ہیں۔ اُن کو تو بے اعتبار و ناقابلِ قبول کہہ دیا جائے۔ لیکن کتبِ تاریخ میں جو واقعات و حالات مذکور ہیں، باوجودیکہ اُن کی کوئی سند مذکور نہیں ہے، پھر بھی وہ سب مسلّم اور مقبول رہیں۔ ع

"بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا"

نادیدہ واقعات پر یقین کرنیکا ذریعہ صرف روایات کی شہادت ہے

دنیا میں جو واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے، اس کے علم کے دو ہی طریقے

ہیں۔ یا تو انسان خود اس واقعہ کے وقت موجود ہو گا یا موجود نہ ہو گا۔ پہلی صورت میں اس کا علم اس کے احساس و مشاہدے پر موقوف ہے اور وہ روایت کے تمام جھگڑوں سے بے نیاز ہے۔ اور دوسری صورت میں اس واقعہ کا علم صرف روایت سے ہو سکتا ہے۔ آپ کا فرض صرف اسقدر ہے کہ روایت کی اچھی طرح تنقید کر لیجئے۔ اور جس طرح دنیا کے دوسرے عملی کاروبار میں واقعات پر یقین کرنے کے ذرائع استعمالِ عام میں ہیں، اِس باب میں بھی انہی کو استعمال کیجئے۔ عقلی خیالات اور ذہنی شبہات کی کوئی حد نہیں ہے، مگر کبھی روزمرّہ کے معاملات میں وہ آپ کے یقین کے سدِّ راہ نہیں ہوتے۔ متواتر مشہور اور مستفیض خبروں کو چھوڑ کر خبرِ آحاد تک پر آپ روزانہ یقین کرتے ہیں۔ خطوط، تار، اخبارات آجکل کی زندگی کا جزو ہیں اور اُن میں سے ہر ایک پر آپ کو کامل وثوق ہے۔ اخبار کے کالموں میں عجیب سے عجیب حیرت افزا واقعات و ایجادات اور طبّی علامات عموماً بیان ہوتی رہتی ہیں اور لوگ اُن کو بلا تامّل تسلیم کر لیتے ہیں۔

آج تمام تجارت کا دارومدار انہی تاروں پر ہے۔ حالانکہ شدید مالی خطرات کا موقع ہے، مگر ہر بیوپاری اور تاجر بخوشی اس خبرِ آحاد پر یقین کر لیتا ہے۔ اور اپنی تمام دولت اُس کی نذر کر دیتا ہے، اور کبھی یہ عقلی مباحث اور شکوک نہیں پیش کرتا کہ ممکن ہے کسی نے غلط کہا ہو، غلط لکھا گیا ہو، ممکن ہے نامہ نگار جھوٹ بولتا ہو، ممکن ہے کاتب نے خود گھڑ کر لکھ دیا ہو، یہ تمام احتمالاتِ عقلی قائم ہو سکتے ہیں، مگر عملی یقین پر ان احتمالات کا مطلق

اثر نہیں پڑتا۔ البتہ جب معاملہ احادیث و اخبار و سننِ نبوی ص کے تسلیم کا آتا ہے، تو اس قسم کے جملہ احتمالات شک و شبہ و وسوسہ کے بجائے رَدِّ احادیث اور انکارِ احادیث میں براہینِ قاطعہ اور دلائلِ واقعی بن جاتے ہیں۔

صحابہ کرام رضؓ نے احادیث کو کیونکر محفوظ رکھا!

دنیا کو تعجب ہے کہ صحابہ رضؓ نے احادیث کے ذخیرہ کو کیونکر اس صحت و جامعیت کے ساتھ محفوظ رکھا کہ رسول اللہ ص کی زبانِ مبارک کا ایک فقرہ بھی ہَوا کے تموّج میں جذب ہو کر فنا نہیں ہوا۔

صحابہ کرام رضؓ نے نہ صرف اِس مقدّس مجموعہ کی حفاظت کی، بلکہ آپؐ کے ایک ایک اشارے، ایک ایک حرکت اور ایک ایک اُدا کو محفوظ کیا۔

ایک بار لوگوں نے حضرت خباب رضؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر و عصر میں قرأت کرتے تھے؟ بولے ہاں! لوگوں نے کہا کیونکر معلوم ہوا؟ فرمایا: ہم آپ کی ریشِ مبارک کی حرکت سے اس کا پتہ لگا لیتے تھے۔ (ابو داؤد)

حضرت ابو سعید خدری رضؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ اندازہ کیا کہ آپ ظہر و عصر کی رکعات میں کتنی دیر قیام فرماتے ہیں، تو معلوم ہوا کہ اوّل کی دو۲ دو رکعتوں میں اتنی دیر جس میں تین آیتیں پڑھ لی جائیں اور اخیر کی دو۲ دو رکعتوں

میں اس کی نصف مدت۔ (ابوداؤد)

ایک بار حضرت عبداللہ رضؓ نے نماز کا طریقہ بتایا اور کہا، کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کی گردش نظر آرہی ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت اغر مزنی رضؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک بار شمار کیا تو معلوم ہوا کہ آپؐ نے ایک نشست میں سو بار استغفار فرمایا۔ (ابوداؤد)

لیکن حدیث کے محفوظ رکھنے کا اصلی ذریعہ حفظِ حدیث تھا۔ یعنی صحابہؓ کرام ان کو ازبر یاد کرتے تھے۔ یہ بات تواتر کے اعلیٰ درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ جو مسلمان آنحضرت صلعم کی شرفِ صحبت سے بہرہ اندوز ہوئے انہوں نے آپؐ کے اقوال و افعال کی حفاظت کا ایسا اہتمام کیا جس کی نظیر کوئی دوسری قوم پیش نہیں کر سکتی۔ وہ حضرات جو قطرات وضوء پر تقاتل اور جدال کرنے والے، موئے مبارک پر مر مٹنے والے تھے، وہ افعال و اقوال کو کیسے ضائع کر سکتے ہیں؟ انہی باتوں کی واقفیت اور آگاہی کا نام اس زمانہ میں علم تھا۔ اور وہ دینی اور دنیاوی دونوں عزتوں کا ذریعہ تھیں۔ اِس لیے ہزاروں صحابہ رضؓ نے جو کچھ دیکھا اور سُنا اور جانا تھا، آنحضرتؐ کے حکم بلغوا عنی (مجھ سے جو کچھ سُنو اور دیکھو اُس کی اشاعت کرو) فلیبلغ الشاھد الغائب "جو مجھے دیکھ رہے ہیں اور مجھ سے سُن رہے ہیں وہ اُن کو مطلع کریں جو اس سے محروم ہیں۔" کے مطابق وہ سب اپنی اولادوں، عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں کو سُناتے اور بتاتے رہتے تھے۔ یہی اُن کی زندگی کا کام اور یہی ان کے شب و روز کا مشغلہ تھا۔ اِس لیے صحابہ رضؓ کے بعد فوراً ہی دوسری نوجوان پُود ان معلومات کی

حفاظت کے لیے کھڑی ہوگئی۔ ان میں سے ہر ایک کو ہر واقعہ کا لفظ لفظ یاد کرنا پڑتا تھا، ان کو دُہرانا پڑتا تھا اور حرفاً حرفاً محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔

عربوں کا حافظہ فطرۃً نہایت قوی تھا وہ سینکڑوں اشعار کے قصیدے زبانی یاد رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ فطرت کا قاعدہ ہے کہ جس قوت سے جس قدر زیادہ کام لیا جائے اسی قدر زیادہ اس کو ترقی ہوتی ہے۔ صحابہ رضؓ اور تابعین نے قوتِ حفظ کو معراجِ کمال تک پہنچایا۔ وہ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک حدیث کو اس طرح زبانی سُنکر یاد کرتے تھے، جیسے آج مسلمان قرآن مجید کو یاد کرتے ہیں۔ ایک ایک محدث کئی کئی ہزار اور کئی کئی لاکھ حدیثیں زبانی یاد کرتا اور یاد رکھتا تھا اور گو بعد میں اپنی یادداشت کے لیے لوگ لکھ بھی لیتے تھے۔ مگر جب تک وہ زبانی یاد نہ رکھتے اہلِ علم کی نگاہوں میں ان کی عزت نہ ہوتی اور وہ خود اپنی تحریری یادداشتوں کو عیب کی طرح چھپاتے تھے تاکہ لوگ ایسا نہ سمجھیں کہ ان کو یہ چیزیں یاد نہیں۔

امام احمد بن حنبل رح کو دس لاکھ، ابو زرعہ رح کو سات لاکھ، یحییٰ بن معین رح کو دس لاکھ، امام مسلم رح کو تین لاکھ، ابو داؤد رح کو پانچ لاکھ، ابوبکر رح کو ایک لاکھ، ابو العباس رح کو تین لاکھ سے زائد، اسحاق بن راہویہ کو ستر ہزار سے زائد حدیثیں یاد تھیں۔ تذکرۃ الحفاظ میں ان کا اور دوسرے حافظینِ حدیث کا مفصل و مبسوط تذکرہ موجود ہے۔

صحابہ کرام رضؓ نے اپنی معلومات کو عموماً تین اسباب سے قیدِ تحریر

میں لانا مناسب نہیں سمجھا:

۱۔۔۔۔۔ ابتداءً آنحضرت صلعم نے (خلطِ قرآن کے باعث) قرآنِ پاک کے علاوہ کسی اور چیز کو کتاب کی صورت میں رکھنے کی ممانعت کر دی تھی۔ جب قرآن پورے طور پر محفوظ ہو گیا تب آخر میں بعض صحابہؓ کو تحریرِ احادیث کی اجازت دیدی۔ لیکن پھر بھی بعض صحابہ رضؓ قیدِ تحریر میں لانے سے آخر دم تک احتیاط برتتے رہے۔

۲۔۔۔۔۔ صحابہ رضؓ کو ڈر تھا کہ وقائع کے تحریری صورت میں آجانے کے بعد لوگوں کو پھر اُن کے ساتھ وہ توجہ اور مشغولیت نہ رہے گی اور لوگ زبانی یاد رکھنے کی محنت سے جی چُرائیں گے۔ یہ ڈر بالکل صحیح ثابت ہوا۔ علم جیسے جیسے سفینوں میں بڑھتا گیا، سینوں سے نکلتا گیا۔ نیز اُن کو یہ بھی خیال تھا کہ ہر کس و ناکس کتاب کے مجموعہ کو ہاتھ میں لے کر عالم بننے کا دعویٰ کر بیٹھے گا، چنانچہ یہی ہوا اور روزانہ اس کے نمونے مشاہد ہیں۔

۳۔۔۔۔۔ ابھی تک عرب میں کسی واقعہ کو لکھ کر اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس کو اپنی کمزوری کا اعلان خیال کرتے تھے۔ محدثین کا خیال تھا کہ زبانی یادداشت تحریری یادداشت سے زائد محفوظ صورت ہے تحریر کو دوسروں کے تصرف سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ ہر وقت خطرہ رہتا ہے مگر جو نقوش دلوں کی لوحوں پر کندہ ہوں، ان میں تغیر و تبدل ممکن نہیں۔

لیکن بایں ہمہ، خود عہدِ نبوی میں اخبار و احکام و سُنن کا سرمایہ جمع ہوتا

شروع ہو چکا تھا۔ اس کثرتِ حافظہ اور فطری حافظہ کے علاوہ حفظِ حدیث کا اہتمام بھی بلیغ تھا۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضؓ کا بیان ہے کہ "میں رات کے تین حصّے کرتا تھا۔ ایک میں سوتا تھا، ایک میں نماز پڑھتا تھا اور ایک میں احادیثِ رسول اللہ صؐ کو یاد کرتا تھا۔" (دارمی)

لوگوں نے حضرت ابوسعید خدری رضؓ سے کہا کہ آپ ہم کو احادیث لکھنے کی اجازت نہیں دیتے؟ فرمایا۔" ہم حدیث کو قرآن کی طرح لکھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ لیکن جس طرح ہم نے رسول اللہ صؐ سے سُنکر حدیثیں یاد کرلی تھیں تم بھی اسی طرح یاد کرلو۔" (دارمی)

میرے خیال میں روایت کا صحت کے ساتھ محفوظ رکھنا دو باتوں پر موقوف ہے۔ ایک قوّتِ حافظہ، دوسرے مروی عنہ سے (جس سے روایت کی جائے) تعلّق۔ اور اِن دونوں باتوں میں سے زائد قوی اور زیادہ دخیل دوسری بات معلوم ہوتی ہے۔ تعلّق کے باعث ضعیف الحافظہ بھی قوی الحافظہ ہو جاتا ہے۔ تعلّق دو وجہ سے ہوتا ہے۔ عظمت سے، یا محبت سے۔ آدمی کے دل میں جس کی عظمت یا محبت ہوتی ہے تو اُسکی ہر بات ہرگز نہیں بھول سکتا۔

یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ جب چاہے اس کا تجربہ کرلیا جائے اور جس قدر چاہے نظائر میں غور و فکر سے کام لیا جائے، ان دونوں میں سے ایک کا یا دونوں کا دخل اور کامل دخل ہوگا۔ جس کی عظمت یا جسکی محبت ہوتی ہے، اس کے الفاظ اور اقوال و افعال ذہن میں صرف اُس وقت کے

لیے نہیں بلکہ مدّتُ العمر کے لیے نقشِ کالحجر ہو جایا کرتے ہیں اور وظیفہ کی طرح اُن کو بار بار رٹا کرتا ہے۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں کو اُٹھا کر دیکھئے کہ صحابہؓ کو حضورؐ کے ساتھ کہاں تک تعلق تھا؟ عظمت کہاں تک تھی؟ اور محبّت کا کیا حال تھا؟ ہم بلا خوفِ تردید اسی دعوے پر تیار ہیں کہ دنیا میں محبت و عظمت کی جس فرد کا وقوع ہوا ہے اور ضرب الامثال بنی ہیں۔ وہ صحابہ رضؓ کی عظمت و محبت کے مقابلہ میں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے اصل و نقل۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ واقعیت ہے۔

غزوۂ اُحد میں حضرت ابوطلحہ رضؓ صحابی حضور صلعم کے سامنے ڈھال لیے کھڑے تھے تاکہ حضورؐ پر غنیم کا تیر نہ پڑے۔ جب حضورؐ سر مبارک اُٹھا کر دیکھتے، تو وہ عرض کرتے بابی انت و امّی لاتشرف یصیبك سهم نحری دون نحوک" یعنی آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں، آپؐ سر نہ اُٹھایئے، ایسا نہ ہو کہ آپ کو کوئی تیر آ لگے، آپؐ کی جان سے پہلے میری جان ہے!

ہجرت کے قصّہ میں ہے کہ جس رات کو حضورؐ نے ہجرت کا ارادہ کیا، تو کفّار نے حضورؐ کے قتل کے ارادہ سے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ حضورؐ نے اپنی جگہ حضرت علی رضؓ کو لٹا دیا اور خود وہاں سے روانہ ہو گئے یہ بے تامّل لیٹے رہے اور جان کی پروا نہ کی۔ اِس قسم کے ہزاروں قصّے صحابہؓ کے تذکروں میں موجود ہیں۔

یہی حال عظمت کا ہے کہ اس سے خوف پیدا ہو کر، ہرگز اُس منظر یا چیز کو بھول نہیں سکتا۔ شیر کو دیکھ کر کوئی ڈر جاتا ہے تو اُس کو گھاس پھُونس

بھی شیر ہی معلوم ہوتے ہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ شیر کو کبھی بھول جائے گا؟ اس کی وجہ شیر کی عظمت ہے اور محبتِ صادق کا اثر تو اس سے بدرجہا زائد ہے۔ پس محبت و عظمت کے ہوتے ہوئے ضعفِ حافظہ نہیں رہتا۔ صحابۂ کرام رض محبت و عظمت میں غایت درجہ کمال رکھتے تھے۔ جس کی نظیر ملنا ناممکن ہے، تو کیسے تصوّر کیا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال ان کو یاد نہ رہیں۔ خصوصاً جب کہ حضور صلعم ہی کی ترغیب و ترہیب انکے کان میں پڑ بھی چکی ہو۔

ترغیب

نضر اللہ عبدا سمع منا حدیثا فحفظہ حتی یبلغہ فرب حامل فقہ الی من ہو افقہ منہ ورب حامل فقہ لیس بفقیہ۔ (ابو داؤد)	"خدا اس شخص کو ترو تازہ رکھے جس نے ہم سے کوئی حدیث سُنی اور اس کو محفوظ رکھا اور دوسرے تک پہنچا دیا' کیونکہ بسا اوقات علم کا حامل اس کو ایسے شخص تک پہنچاتا ہے جو اس سے زیادہ سمجھدار ہوتا ہے اور بسا اوقات حاملِ فقہ سمجھ دار نہیں ہوتا)

حضور صلعم نے حجۃ الوداع کے خطبہ کے آخری حصّہ میں فرمایا:

فلیبلغ الشاھد الغائب۔ یعنی جو لوگ موجود ہیں' وہ ان ہدایات اور احادیث کو اُن کو بھی پہنچا دیں' جو موجود نہیں۔"

اِس ارشاد سے روایتِ حدیث کا جواز، بلکہ وجوب ثابت ہوتا ہے۔ اسی بنا پر بعض صحابہ رضؓ نے اُن احادیث کو جن کو مدت العمر مخفی رکھا تھا، مرتے وقت بیان و روایت کیا۔ تاکہ امرِ تبلیغ کی تعمیل ہو جائے۔ نیز اس ارشاد سے حدیث کا حجت ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ موٹی بات ہے اور بدیہی امر ہے کہ حدیث کو صرف کانوں تک پہنچا دینا ایک بے کار بات ہے۔ مقصود عمل کرانا ہے اور یہ ارشاد حجۃ الوداع میں صادر ہوا تھا جو رسالت کا آخری دُور تھا اور جس میں اتنا بڑا مجمع تھا کہ مسلمانوں کا اس سے زیادہ بڑا اجتماع اس کے اول یا بعد کبھی نہیں ہوا۔ اس بات کو کوئی ادنیٰ فہم والا انسان بھی باور نہیں کر سکتا کہ یہ ارشاد صرف زبانی تبلیغ کی حد تک تھا اور عملی حیثیت سے نہ تھا۔

اِس مجمع میں حضور صلعم نے تمام اعمالِ حج کی تعلیم فرمائی، کیا وہ تعلیمات صرف سُنانے کے لیے تھیں۔ اور موجودہ مجمع یا آئندہ حاجیوں کے لیے ایک دستور العمل کا کام دینے کے لیے نہ تھیں؟ وہ کونسا قانون ہے جو صرف سُنانے کے لیے ہوتا ہے؟ اور وہ کونسی تعلیم ہے جو دستور العمل بنانے کے لیے نہیں ہوتی؟ اِس کو کوئی باطل سے باطل مذہب والا بھی نہیں مان سکتا۔

ترہیب

مَن کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار (شیخان احمد و ترمذی وغیرہم)

"یعنی جو شخص میری طرف دیدہ و دانستہ کوئی غلط بات منسوب کرے، تو اپنا ٹھکانہ دوزخ کو سمجھے۔"

علاوہ بریں عرب کا حافظہ دنیا کے نزدیک مسلّم ہے اور تاریخ اس کی

شاہد ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضؓ نے ستّو شعر کا قصیدہ ایک مرتبہ سُن کر یاد کر لیا تھا۔ بعض واقعات کو نقل کرتے وقت صحابہؓ کہتے ہیں، گویا کہ یہ واقعہ اِس وقت میرے سامنے ہو رہا ہے اور حضرت امام بخاریؒ کا ایک مجلس میں ستّو حدیثیں منقلب المتن والاسناد کو سُنکر ہر ایک کی تغلیط کے بعد اُن سب کو بعینہٖ سُنا دینا۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی تصحیح کر دینا۔ اور امام ترمذیؒ کا بہ حالتِ عدم بینائی ایک درخت کے نیچے گزر کر سر جُھکا لینا۔ اور وجہ دریافت کرنے پر وہاں درخت ہونے کی خبر دینا، جو کہ اُس وقت نہ تھا اور پھر تحقیق سے اس خبر کا صحیح ہونا۔ اور محدثین کا اپنے شیوخ کے امتحان کے لیے گاہے گاہے احادیث کا اعادہ کرانا اور ایک حرف کی کمی بیشی نہ نکلنا۔ یہ سب سیر و تواریخ و اسماء الرّجال میں مذکور و مشہور ہے جو قوّتِ حافظہ پر دلالت کرنے کے لیے کافی ہے۔

اُس زمانہ میں علمِ دین کا چرچا اور مشغلہ اور رغبت و شوق اور حافظہ اور تدوین و ثقاہت و عدالت کے حالات اگر تاریخ سے معلوم کیے جائیں تو حیرت ہو گی۔

تدوین و ثقاہت کا حال اُس زمانہ میں یہ تھا کہ فقہاء و محدثین اور علماء میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو تہجّد گزار، متقی اور متورّع، عفیف و باحیا اور بامروّت نہ ہو۔ بہت حضرات ایسے تھے کہ رات بھر خدا کی عبادت میں گزارتے اور عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے۔ حیاء کی یہ حالت تھی کہ خود ان کا فتوےٰ کتابوں میں موجود ہے کہ جو شخص بازار میں کھاتا ہو یا راستہ میں پیشاب کرتا ہو، اس کی

شہادت قاضی کے یہاں مقبول نہیں کیونکہ اس میں حیا نہیں، اور جس میں حیا نہیں، وہ جھوٹ بولے یا جو کچھ بھی کر گزرے بعید نہیں۔ جس زمانہ میں اس قسم کے رواج تھے اور شرم و حیا اس درجہ تھی اور مطلق العنانی اور آزادی نہ تھی تو ظاہر ہے کہ علماء و محدثین بھی روایات میں کس قدر اور کس درجہ احتیاط کرتے ہوں گے، کیونکہ یہ خوف ہوگا کہ اگر ادنیٰ سی غلطی ہوگئی تو ہماری روایت متروک ہو جائے گی اور دجّال و کذّاب اور خدا جانے کس کس لفظ سے مشہور ہونگے۔

افسوس اِس کا ہے کہ ہمارے ابنائے زمانہ اپنے اسلاف کے علمی ذخیروں کا مطالعہ ہی نہیں کرتے اور کوٹھیوں اور بنگلوں میں پڑے ہوئے، جو منہ میں آتا ہے رجماً بالغیب ہانک دیتے ہیں اور روایاتِ سلف صالحین کو اپنی روایات پر، اور ان کو ضعفِ حافظہ، قلتِ رغبت، قلتِ خشیت میں اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ حفاظتِ روایات کے صرف دو[۲] ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ "قوتِ حافظہ" اور "مروی عنہ سے تعلق" اور تواتراً ثابت ہے کہ یہ دونوں باتیں خیر القرون میں اس درجہ موجود تھیں کہ دنیا اُس کی نظیر لانے سے قاصر و عاجز ہے۔ اس کے علاوہ یہ ہے کہ چونکہ حق تعالےٰ کو اُن سے یہ کام لینا تھا اِس وجہ سے غیبی طور پر بھی اس موضوع میں اُن کی تائید فرمائی گئی تھی۔ مثال کے طور پر حضرت ابو ہریرہ رضؓ کا قصّہ ہے کہ اُن کی نسیان کی شکایت پر حضور صؐ نے ان کی چادر میں کچھ کلمات پڑھ دیئے اور انہوں نے وہ چادر اپنے سینہ سے چمٹالی۔ حدیثوں میں مذکور و مسطور ہے کہ اِس کے بعد وہ کچھ

نہیں بھولتے تھے۔

غیبی طور سے مُراد وہ طریقے ہیں، جو ظاہری اسباب کے علاوہ ہوں۔ خداوند تعالےٰ کو اپنے دین کی تکمیل اور حفاظتِ تام مقصود تھی۔ اس لیے سلف صالحین اور خیر القرون میں تمام سامان ترقیِ دین کے جمع فرما دیئے تھے۔ اور تمام موانع مرتفع کر دیئے تھے۔ اِس بنا پر دین کی حفاظت اور ترقی ایسی ہوئی کہ کسی مذہب والے کو نصیب نہ ہوسکی۔ بالکل یہی حالت ہوئی جو موجودہ زمانہ میں صنائع وایجادات کی ہے۔

حیرت انگیز بات ہے کہ جس زمانہ میں نہ آلاتِ اشاعت موجود تھے، نہ سفر کرنا آسان تھا نہ تبادلۂ خیالات کے ذرائع تھے۔ مگر اصولِ اسلام کی تصانیف اور علمی کارنامے اس وقت کے ایسے ایسے اور اس تعداد میں موجود ہیں کہ ان کا جواب نہیں ہوسکتا۔ یہ نتیجہ سوائے تائیدِ غیبی کے، کس چیز کا ہے؟

الغرض حفاظتِ حدیث کے اسباب بدرجۂ تمام وکمال جمع فرما دیئے۔ حافظے اسی نوع کے دیئے جس کی ضرورت تھی۔ شوق ورغبت ایسی دی کہ اس کو عشق کا درجہ کہنا چاہیئے۔ حدیث میں خلط ملط کرنے سے خوف ایسا دیا کہ موت کا خوف بھی اُس کے سامنے کوئی چیز نہیں۔ پھر حدیث کے حُجّت ہونے میں احتمالات اور شبہات نکالنا محض بے عقلی کی بات ہے۔

پس عہدِ نبی کریمؐ اور عہدِ صحابہ رضؓ میں قرآنِ پاک کی طرح حدیثوں کی کتابت نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہرگز صحیح نہیں ہے کہ احادیث کی حفاظت نہیں ہوئی

یا احادیث محفوظ نہیں۔ یہ نتیجہ وہی نکال سکتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ حفاظت صرف کتابت سے ہو سکتی ہے۔ ایسا شخص سلف کے حالات سے ناواقف ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اُس وقت کتابتِ احادیث ممکن ہی نہ تھی۔ اس وجہ سے وقتی طور پر کتابت کی ممانعت بھی کر دی گئی تھی۔

ناممکن اِس بنا پر تھا کہ حدیث نام صرف اقوال کا نہیں بلکہ حدیث جس طرح قولِ رسول کو کہتے ہیں، اسی طرح فعلِ رسولؐ اور تقریرِ رسولؐ کو بھی حدیث کہتے ہیں۔ تقریر کے معنیٰ کسی کے فعل کو برقرار رکھنے کے ہیں۔ یعنی کسی کو کرتے دیکھ کر اُس کو منع نہ کرنا، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے باعث حضورؐ کے سچے جانشینوں کے اقوال و افعال بھی حجت ہیں، اور ملحق بالحدیث ہیں۔

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم۔ یعنی میرے صحابی ستاروں کی طرح ہیں، ان میں جس کی بھی تم اتباع کر لوگے، ہدایت پا جاؤ گے۔ (جمع الفوائد)

علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین۔ یعنی میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔

اِس بنا پر حدیث و سنت صرف قولِ رسولؐ کا نام نہیں، بلکہ یہ لفظ صحابہؓ اور رسول اللہ صلعم کے اقوال و افعال کو اور خلفائے راشدین کی سنت کو بھی عام ہے، تو اِن سب اجزاء کی عہدِ نبوی میں کتابت کیسے ممکن تھی؟ کیا سنتِ خلفاء وجود سے قبل قیدِ کتابت میں آجاتیں؟ اگر کتابت

ہوتی تو صرف اقوالِ رسول اللہ ؐ کی ہوتی۔

میرے فہمِ نارسا میں یہ بھی ممکن نہ تھا، کیونکہ حضور صلعم کے ارشاد کبھی مجمع میں ہوتے تھے، کبھی دو چار آدمیوں کے سامنے، کبھی صرف ایک شخص سے خطاب ہوتا، کبھی تنہائی میں ازواج سے، کبھی بچوں سے، کبھی معرکہ میں دشمنوں سے، تو ان سب کے لکھنے کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی تھی کہ ایک کاتب ہر وقت جلوت وخلوت میں، اور نشست و برخاست میں ساتھ رہے اور ایسے مشغلہ کو شروع کرنا جو پورا نہ ہو سکے اور مفید بھی نہ ہو بلکہ مُضر ہو بعید از عقل ہے۔

علمائے اسلام کے پاس شرعی تاریخ ایسی مکمل ہے (جس کو علمِ حدیث کہتے ہیں) جس کی نظیر نہ کسی دنیاوی تاریخ میں ہے نہ کسی دینی تاریخ میں۔ دنیا کے کسی مذہب کو لے لیجئے، زائد سے زائد یہی کر سکتے ہیں کہ ایک مذہبی کتاب پیش کر دیں اور یہ کہیں کہ یہ آسمانی کتاب ہے۔ (یہ بات جدا ہے کہ یہ دعوے کسوٹی پر پرکھنے سے صحیح ثابت ہو یا غلط) لیکن یہ کسی کا مُنہ نہیں کہ اپنے رہنما کے حالات جن پر کتاب کا اترنا مانتے ہیں، ان کی عملی تعلیمات پوری پوری پیش کر سکے۔ یہ فخر صرف اسلام کو حاصل ہے کہ کتابِ آسمانی کے ساتھ، اپنے پیغمبر ؐ کی پوری سوانحعمری اور ہر قسم کی تعلیم پیش کر سکتے ہیں۔ جس کے متعلق بعض عیسائیوں تک کو بالاضطرار یہ کہنا پڑا ہے کہ علمائے اسلام اپنے پیغمبر ؐ کی ہر وقت کی نشست و برخاست، چال ڈھال سب اس طرح بتا سکتے ہیں کہ گویا اس وقت سامنے ہیں۔ حتیٰ کہ

وہ بتا سکتے ہیں کہ کنگھی اس طرح کرتے، سُرمہ اس طرح لگاتے، کھانا اس طرح کھاتے، پانی اس طرح پیتے، سواری پر اس طرح سوار ہوتے، سونے کیوقت اس طرح اور جاگنے کے وقت اس طرح، یہ سب بتا سکتے ہیں۔"

اس شرعی ذخیرہ کے فراہم ہونے کی حقیقی وجہ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دلوں میں دینِ حق کی محبت بدرجۂ عشق ڈال دی، اور اس ذخیرہ کے فراہم ہونے کے لیے جتنے اسبابِ ظاہری کی ضرورت تھی، سب پیدا کر دیئے۔ حافظے ایسے دیئے کہ اب لوگوں کو اُس کا یقین آنا مشکل ہو گیا لیکن تواتر سے ثابت ہے، اِس لیے تکذیب کی گنجائش نہیں۔ دیانت اور تقویٰ ایسا دیا کہ دین تو بہت بڑی چیز ہے تمام عمر میں دنیا کی کسی بات میں بھی ان سے جھوٹ نہیں سرزد ہوا۔ روایت میں احتیاط کی یہ حالت تھی کہ ایک محدّث دور دراز سفر کر کے کسی کے پاس حدیث سُننے گئے۔ دیکھا کہ ان کا گھوڑا چھُوٹ گیا ہے اور اس کے پکڑنے کے لیے خالی توبرا دکھا کر دھوکہ دے رہے ہیں تاکہ وہ دانہ کے لالچ میں آجائے۔ پس یہ محدّث وہاں سے لوٹ آئے اور کہا کہ جو شخص گھوڑے کو دھوکہ دیتا ہے، اس پر کیا اطمینان ہو سکتا ہے کہ روایتِ حدیث میں حزم و احتیاط کرے گا۔ بعض ائمۂ حدیث کی یہ عادت تھی کہ کسی محدّث اور اُستاد سے ایک مرتبہ حدیث سُن کر اطمینان نہ کرتے اور دوبارہ، سہ بارہ خفیہ طور پر اُن کی مجلس میں پہنچتے اور سنتے رہتے۔ اگر انھوں نے وہ حدیث پھر روایت کی اور الفاظ میں کچھ تغیّر و تبدل نہ ہوا، تب تو اس حدیث کو صحیح سمجھا، ورنہ ترک کر دیا۔ اور اگر

زیادہ تغیر پایا اور معلوم ہو گیا کہ عمداً ایسا کیا ہے تو اس محدث کو تمام عمر کے لیے دجّال، کذاب مدلس کا خطاب مل گیا، جو آج تک ایسے لوگوں کے نام کیساتھ لگا ہوا ہے اور اگر قرائن قریبہ سے بلا عمد ایسا کرنا معلوم ہوا تو وہم اور غفلت کی طرف منسوب کیا۔

ہمتوں کی اور عشق حدیث کی یہ کیفیت تھی کہ ایک حدیث کے لیے منزلوں کا سفر کرتے۔ اس زمانہ میں جب کہ سفر میں جان کا بھی خطرہ تھا اور مال کا بھی۔ ذیل میں ہم بر سبیل تذکرہ اس سلسلے میں ایک عیسائی کا تبصرہ نقل کرتے ہیں۔ والفضل ما شهدت به الاعداء۔

ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی، مولوی فاضل پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی نے ۱۴ر دسمبر ۳۲ء اور ۱۵ر دسمبر اور ۲۱ر دسمبر ۳۲ء آسونوش بلڈنگ میں کچھ لیکچر دیئے، یہ انگریزی میں دیئے گئے تھے جن کا ترجمہ محمد عزیز صاحب ایم اے، ایل۔ ایل۔ بی، رفیق دار المصنفین نے کرنے کے بعد رسالہ معارف میں شائع کرایا۔ ان لیکچروں میں پروفیسر موصوف نے اوّل اُن کتابوں کا ذکر کیا جو فن حدیث کے متعلق زمانہ حال کے یورپین مستشرقین نے لکھی ہیں۔ پھر بیان کیا کہ ڈاکٹر اسپر نگر سابق پرنسپل مدرسہ کلکتہ اور ان کے بعد سر ولیم موئر نے، پھر گولڈ زیہر نے بہت وسیع معلومات اس فن کے متعلق جمع کی ہیں۔ ان ہی کے جمع کردہ مواد پر پروفیسر گیلام کی کتاب "احادیث پر اسلام کی بنا ہے"۔ پروفیسر گیلام وہ فاضل ہیں جنہوں نے احادیث کے وسیع لٹریچر کی ایک ضخیم فہرست تیار کی ہے، جو ایک

بہت قابل مستشرق پروفیسر کی نگرانی میں چھپ رہی ہے۔

پروفیسر محمد زبیر صاحب فرماتے ہیں کہ "احادیث کے سلسلہ میں مسلمانوں نے جس غیر معمولی سرگرمی کا ثبوت دیا ہے، دنیا کی علمی تاریخ اس کی نظیر سے خالی ہے۔ ان کا نظام اسناد جسے انھوں نے احادیث کے سلسلے میں قائم کیا اور اسماء الرّجال پر وہ وسیع لٹریچر جو انہوں نے احادیث کے باقاعدہ اور ناقدانہ مطالعہ کی غرض سے فراہم کیا۔ ان کی وہ کتابیں جن میں صحیح اور موضوع حدیثوں کے چھانٹنے کے لیے موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ یہ سب آج بھی دنیا کی علمی تاریخ میں بے مثال ہیں۔ اگرچہ کچھ حدیثیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں قلم بند ہو چکی تھیں تاہم دوسری صدی تک یکجا کر کے (کتابی صورت میں) لانیکی کوشش نہیں کی گئی۔ اس صدی کے شروع میں حضرت عمر ثانی رح (عمر بن عبدالعزیزؒ) نے بعض محدثین کو وہ سب حدیثیں جمع کرنے کی ہدایت فرمائی، جو مل سکتی ہیں۔ حضرت عمر ثانی رح کے بعد مختلف محدّثین نے اور متعدد صوبوں کے محدّثین نے اس عظیم الشّان کام کو اٹھالیا، جس کی ابتداء خلیفہ موصوف نے کی تھی۔ اور حدیثوں کے بہت سے مجموعے مرتب کیے۔ جن میں سے اکثر مفقود ہیں، لیکن ان کا ذکر ابنؔ الندیم کی کتاب میں موجود ہے۔ پھر اس کے بعد دوسری اور تیسری صدی میں بہت سے مجموعے تیار کیے گئے، یہ محفوظ ہیں اور دنیا کے مختلف حصّوں میں مسلمان ان کو پڑھتے ہیں۔ محدّثین کے یہ تمام اَدوار تلاشِ حدیث کی حیرت انگیز سرگرمی ظاہر کرتے ہیں۔ حدیث

سے ان کو کمال درجہ کی محبت تھی۔ اس کے لیے ان کے جوش و حوصلہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کوئی بھی مصیبت ایسی نہ تھی جو اس کی خاطر وہ برداشت نہ کر سکتے ہوں۔ جو ان میں دولت مند تھے وہ اس کے لیے اپنی دولت قربان کر دیتے تھے اور جو غریب تھے وہ اپنی غربت کے باوجود اپنی زندگیاں اس کے لیے وقف کر دیتے تھے۔

زُہری رحہ نے حدیث کی خاطر اپنی دولت کو پانی کی طرح بہا دیا۔ ربیعہؒ نے اس کی تلاش میں اپنی تمام مِلک صرف کر دی اور آخر میں اپنے مکان کے شہتیر بھی فروخت کر دیئے، اور اُن سڑی ہوئی کھجوروں پر گزر کرنے لگے، جن کو اہلِ مدینہ پھینک دیا کرتے تھے، ابنِ سیرین رحہ جب کوفہ گئے تو وہاں چار ہزار طالب علم حدیث کے موجود تھے۔ علی بن عاصم رحہ کے درسِ حدیث میں تین ہزار طلبہ شریک ہوتے تھے۔ سلیمان بن حربؒ کے درس میں چالیس ہزار، عاصم بن علی رحہ کے درس میں دس لاکھ سے زائد۔ یزید بن ہارونؒ کے درس میں ستر ہزار۔ ابو مسلم الکیجی کے درس میں نہایت کثیر تعداد طلبۂ حدیث کی ہوتی تھی۔ جو لوگ لکھنے والے بیٹھتے تھے وہ چالیس ہزار سے زیادہ تھے اس کے بعد ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنھوں نے حدیثیں وضع کیں۔ جن لوگوں نے وضعِ احادیث کا آغاز کیا وہ حسبِ ذیل ہیں:

مبتدعین جماعتوں کے سردار۔

مختلف فرقوں کے مبلغ۔

اُمراء کے خوشامدی۔

قصہ گو۔

لیکن علمِ حدیث کی تاریخ کے ہر دَور میں ایک کثیر تعداد حق پسند، خداترس، متدیّن اور محتاط محدّثین کی بھی رہی جو نہ تو اشخاص اور جماعتوں کی پرواہ کرتے تھے اور نہ قوت، اقتدار اور رائے عامّہ سے ڈرتے تھے۔ اُن کی زندگی کا واحد مقصد اپنے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا حاصل کرنا، ان کی اصالت، اور صحت کو محفوظ رکھنا اور مسلمانوں میں ان کی اشاعت کرنا تھا۔ وہ حدیثوں کا مطالعہ نہ تفریح اور وقت گزارنے کے لیے کرتے تھے نہ مالی نفع و شہرت کے لیے اور نہ اس لیے کہ لوگ اُن کا اثر قبول کریں۔ حدیث کو وہ حدیث کے لیے حاصل کرتے تھے۔ ان کے نزدیک علم وسیلہ نہیں بلکہ مقصد تھا۔ بقول سفیان ثوریؒ، تحصیلِ حدیث ان کے لیے ایک مرض ہو گئی تھی جس سے خود انہیں کوئی چارہ نہ تھا۔

صحابۂ کرام رضؓ حدیثوں کے بیان کرنے میں حد درجہ احتیاط کرتے تھے، محدّثین کے دوسرے دَور میں بھی بہت سے ایسے تھے جو اسنادِ حدیث کے بارے میں نہایت متدیّن اور سخت تھے، اِسی طرح ان کے بعد جو آئے مثلاً امام شافعیؒ۔ یحییٰ بن معینؒ۔ احمد بن حنبل۔ امام بخاریؒ۔ امام مسلمؒ۔ ابوداودؒ، ترمذیؒ اور دوسرے اکثر محدثینؒ۔ یہ سب روایت کے معاملہ میں بے حد محتاط تھے۔ یہ متدیّن محدّثین جو علمِ حدیث کے ستون تھے، تاریخِ اسلام کی ابتداء ہی سے جماعتوں کی کشاکش سے بالکل علیٰحدہ رہے اور صاحبِ اقتدار جماعت سے کسی قسم کا واسطہ نہ رکھتے تھے۔ بعضوں نے اِس کے باوجود مقتدر جماعتوں

سے بڑی بڑی ایذائیں برداشت کیں۔ یہ ان ہی متدین اور حق گو محدثین کی مسلسل جانفشانیوں کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں تلف ہونے سے محفوظ ہیں۔

گولڈزیہر کہتا ہے کہ دنیائے اسلام کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک، اندلس سے وسط ایشیا تک حدیث کے یہ جفاکش اور نہ تھکنے والے متلاشی گشت کرتے اور ہر مقام سے اپنے لیے حدیثیں جمع کرتے رہے۔ حدیثوں کو جو مختلف صوبوں میں پھیلی ہوئی تھیں، ایک مستند شکل میں جمع کرنے کا یہی تنہا ممکن طریقہ تھا۔ اَلرّحَالُ یا الجوال کا معزز لقب ان سیّاحوں کے لیے لفظی ہی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور طوّاف الاقالیم کے لقب میں ان کے لیے کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ اِن میں سے بعض ایسے تھے جنہوں نے تمام مشرق و مغرب میں چار مرتبہ سفر کیا تھا۔ ان تمام ملکوں میں ان کے سفر کی غرض مناظر کا دیکھنا یا تجربہ حاصل کرنا نہ تھا، بلکہ ان کا مقصد ان مقامات میں محدثین سے ملنا اور ہر ایک سے حدیث سُننا اور مُستفید ہونا تھا۔ موجودہ مجموعوں کی شکل میں حدیث کی تدوین پہلی صدی ہجری کے آخر میں شروع ہوئی اور اس کے بعد تیزی کے ساتھ ہوئی۔ یہاں تک کہ تیسری صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی حدیث اور متعلقاتِ حدیث پر تقریباً تمام مُستند اور اہم کتابیں لکھ دی گئیں، تدوینِ حدیث کے ساتھ ساتھ محدثین تمام رُوات کے حالات بھی دریافت کر کے اُن کی حیثیات پر نقد و تبصرہ کرتے گئے اور احادیث کی جرح و تعدیل کے لیے ان رواۃ کے حالات پر ایک وسیع لٹریچر تیار کیا اور موضوعات پر

ایک ضخیم دفتر تیّار کر دیا اور جرح و تعدیل کے لیے بہت سے فنون قائم کیے،
ان حالات کو عیسائیوں سے معلوم کرنے کے لیکچروں کا خلاصہ ختم ہوا۔ منکرینِ حدیث
غور کریں کہ انہیں اپنی تحریرات اور اپنے مقولات پر نوحہ و ماتم لازم ہے
یا نہیں ؟

حفظِ حدیث کا اہتمام بلیغ

عہدِ نبویؐ

عہدِ نبوی میں حدیثوں کو محفوظ
رکھنے کے لیے یہ اہتمام تھا کہ صحابہ رضؓ حدیثوں کا دَور کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت
انس رضؓ کا بیان ہے کہ "ہم لوگ آنحضرت صلعم کی زبان مبارک سے حدیثیں سُنتے
رہتے تھے، جب آپ مجلس سے اُٹھتے تو ہم آپس میں حدیثوں کا دَور کرتے تھے۔
ایک دفعہ ایک آدمی کُل حدیثیں بیان کر جاتا، پھر دوسرا، تیسرا! بسا اوقات ساٹھ
ساٹھ آدمی مجلس میں ہوتے تھے اور ساٹھوں باری باری سے بیان کرتے تھے اس
کے بعد جب ہم اُٹھتے تھے تو حدیثیں اس طرح ذہن نشین ہوتی تھیں کہ گویا ہمارے
دلوں میں بو دی گئی ہیں۔" (مجمع الزوائد صہ $\frac{۱۶۱}{ج ۱}$)

حضرت معاویہ رضؓ کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ "عہدِ نبوی میں فرض
نمازوں کے بعد مسجد میں صحابۂ کرام رضؓ بیٹھ جاتے اور قرآنِ پاک اور احادیثِ نبویہ
کا اندازہ کرتے تھے۔" (مستدرک: جلد ۱ صہ ۹۴)

حضرت ابو سعید خدری رضؓ کا بیان ہے کہ "صحابۂ کرام رضؓ جب کہیں بیٹھتے
تھے تو اُن کی گفتگو کا موضوع فقہ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں ہوتی
تھیں یا پھر یہ کہ کوئی آدمی قرآنِ پاک کی کوئی سورۃ پڑھے یا کسی سے پڑھنے

کو لکھے۔ (مستدرک حاکم: صہ ۹۴)

دو در کرنے کے علاوہ انفرادی طور پر حدیثوں کو یاد کرنے کا بڑا اہتمام تھا۔ اور جن کو باوجود کوشش کرنے کے حدیثیں یاد نہ ہوتی تھیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی شکایت کرتے تھے اور پوچھتے تھے کہ حدیثوں کو محفوظ رکھنے کی کیا تدبیر کریں؟ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضہ اور حضرت انس رضہ کے بیان سے اوپر (زیر عنوان عہدِ نبوی میں حدیث کی کتابت) معلوم ہو چکا ہے۔ نیز حضرت ابوہریرہ رضہ کا یہ بیان بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ میں حدیثوں کو صرف دل سے یاد کرتا تھا اور حضرت عبداللہ ابن عمرو از بر کرنے کے ساتھ ساتھ لکھتے بھی تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضہ کا بیان مسلم ج ۱: صہ ۱۰: ابن ماجہ: صہ ۹۴ وغیرہ میں ہے۔

کنا نحفظ الحدیث۔ یعنی ہم حدیثیں یاد کیا کرتے تھے۔

اس قسم کے مزید واقعات نقل کر کے بات کو طول دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ صرف ایک بات لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ آنحضرت صلعم کا صحابہ رضہ کو نہایت تاکیدی حکم تھا کہ "جو لوگ میری مجلس میں حاضر ہوں وہ غیر حاضروں کو میری حدیثیں ضرور پہنچا دیں"۔ (بخاری: ج ۱ صہ ۱۶) نیز ان لوگوں کے حق میں تروتازگی و سرسبزی کی دعا فرمائی تھی جو آپ کی حدیثوں کو سن کر خوب اچھی طرح یاد کر لیں اور پھر ان کو بجنسہٖ دوسروں تک پہنچا دیں۔

نضر اللہ امرأ سمع مقالتی، دفی روایۃ حدیثنا کما فی الدارمی صہ ۳۰۔ فحفظها ووعاها وادّاها دفی روایۃ فبلغه دارمی صہ ۴۲ کما سمع مشکوٰۃ صہ ۳۵ (بحوالہ احمد ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

(اللہ تعالیٰ اس بندہ کو سرسبز (خوش) رکھے جو میری کوئی حدیث
سُن کر یاد کرلے اور خوب سمجھ لے، پھر اس کو جس طرح سُنا ہے،
اسی طرح دوسروں تک پہنچا دے۔)

صحابہ رضؓ کے حالات سے جو لوگ باخبر ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ آنحضرت صؐ
کے اِس حکم کی تعمیل اور اِس دعا میں اپنے کو شامل کرنے کے لیے انہوں نے ہرگز
کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا ہوگا۔

عہدِ صحابہ کرامؓ

عہدِ صحابہ رضؓ میں بھی حدیثوں کو ازبر کرنے
کا بیش از بیش اہتمام تھا۔ حضراتِ صحابہ رضؓ
اپنے شاگردوں کو یاد کرنے کی برابر تاکید کرتے رہتے تھے اور محفوظ رکھنے کی
تدبیر بھی بتایا کرتے تھے۔

۱۔ حضرت ابنِ عبّاس رضؓ فرماتے تھے:

تَذَاكَرُوا هٰذَا الْحَدِيْثَ لَا يَنْفَلِتُ مِنْكُمْ (دارمی ص۴۸)

"حدیثوں کا آپس میں مذاکرہ (دَور) کیا کرو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے ہاتھ
سے نکل جائے۔"

۲۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے:

رُدُّوا الْحَدِيْثَ وَاسْتَذْكِرُوْهُ فَاِنَّهٗ اِنْ لَّمْ تَذْكُرُوْهُ يَذْهَبُ (دارمی)

"حدیث کو بار بار پڑھ کر دُہرایا کرو اور اس کو مستحضر کرو۔ اگر اس طرح یاد نہ
کروگے تو جاتی رہے گی۔"

۳۔ ان کی یہ تاکید بھی تھی کہ ہر روز کچھ حدیثیں بیان کیا کریں۔ آپ فرماتے ہیں کہ کوئی یہ خیال نہ کرلے کہ ابھی تو کل ہی بیان کیا ہے، لہذا آج بیان نہ کروں گا، نہیں آج بھی بیان کرو اور پھر آئندہ کل کو بھی بیان کرنا۔

۴۔ حضرت ابو سعید خدری رضؓ بھی آپس میں حدیث کے مذاکرہ کی تاکید کیا کرتے تھے۔ (دارمی ص۷۹، مستدرک، ج۱ ص ۹۴) اور وہ اس باب میں اتنے سخت تھے کہ شاگرد اگر درخواست کرتے کہ حدیثیں لکھوا دیجئے، تو انکار کر دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ جس طرح ہم نے آنحضرت ﷺ سے حدیثوں کو سُن کر حفظ کیا ہے تم بھی حفظ کرو۔ (دارمی ص۶۶)

۵۔ حضرت علی رضؓ اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے

تُذَاكَرُوا الْحَدِيْثَ فَاِنَّكُمْ اِلَّا تَفْعَلُوْا يَنْدَرِسُ (مستدرک: ج۱، ص ۹۵)

۶۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضؓ کی سخت تاکید تھی کہ:

تَذَاكَرُوا الْحَدِيْثَ فَاِنَّ ذِكْرَ الْحَدِيْثِ حَيَاتُهٗ (مُستدرک صفحہ ۹۵- دارمی صفحہ ۷۹)

"حدیثوں کا مذاکرہ کرتے رہو کہ یہی اُس کی بقا کا سامان ہے"۔

۷۔ حضرت علی رضؓ کا ارشاد ہے:

تذاوروا وتدارسوا الحدیث ولا تترکوہ یدرس

(دارمی: ص ۷۹ وکنز العمال: ج ۵ ص ۲۴۲)

"ایک دوسرے سے ملتے رہو اور باہم حدیث کا مذاکرہ کرتے رہو، اس کو چھوڑ نہ دو کہ فنا ہو جائے"۔

صحابہ کرام کے شاگرد اپنے اساتذہ کے اِن احکام کا پورا احترام کرتے تھے

اور حدیثوں کے مذاکرات سے کبھی غافل نہیں رہتے تھے۔ چنانچہ دارمی کے صہ ۷۹ پر اور تذکرہ صفحہ ۱۱۹ پر عطاء کا بیان ہے کہ "جب ہم حضرت جابر رضہ کے پاس سے حدیثیں سُن کر اُٹھتے تھے تو باہم مذاکرہ کرتے تھے۔ ہمارے ہم سبقوں میں ابوزبیر کا حافظہ سب سے اچھا تھا، ان کو سب سے زیادہ حدیثیں یاد ہوتی تھیں"۔

مستدرک: ج ۱ ص ۹۴ پر ابنِ بریدہ کا بیان ہے کہ "ہم مسجد میں نماز کے بعد بیٹھ جاتے اور احادیثِ نبویہ کا مذاکرہ کرتے"۔

دارمی کے صفحہ ۷۹ پر ہے کہ "زہری عشاء کی نماز کے بعد حدیث کا مذاکرہ کرنے بیٹھتے تو صبح تک یہ مشغلہ جاری رہتا"۔

دارمی میں یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ ابنِ مسعود رضہ نے اپنے شاگردوں سے پوچھا کہ تم لوگ آپس میں ملتے رہتے ہو اور کہیں ایک جگہ بیٹھ کر حدیث کا مذاکرہ بھی کرتے ہو؟ شاگردوں نے جواب دیا، ہم نے تو اس کا اس قدر اہتمام کیا ہے کہ ہمارا کوئی ساتھی کہیں غایب ہو جاتا ہے تو اگر وہ کوفہ کی آخری سرحد پر بھی ملتا ہے تو ہم وہیں جاکر اُس سے ملتے ہیں۔

عہدِ تابعین

صحابہ رضہ کے بعد تابعین کا دَور آیا، تو وہ بھی اپنے شاگردوں کو حدیثیں حفظ کرنے کے لیے دَور اور مذاکرہ کی ہدایتیں کرتے رہے۔ چنانچہ دارمی میں عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ زہریؒ اور علقمہؒ کی وہ ہدایات قریب قریب صحابہ رضہ کے مذکورہ بالا الفاظ میں منقول ہیں۔ انہی تاکیدوں کا نتیجہ تھا کہ حارث ابنِ زید عکلیؒ، قعقاع ابن یزیدؒ، مغیرہؒ اور فضیلؒ عشاء کی نماز کے بعد مذاکرہ کرنے کے لیے بیٹھتے تو صبح

ہی کو یہ مجلس برخاست ہوتی تھی۔

(دارمی ص۸۱، تہذیب ج۱ ص۲۷)

یونس رح کا بیان ہے کہ جب ہم حسن بصری رح کے پاس سے حدیثیں سُنکر اُٹھتے تھے تو آپس میں اس کا دَور اور مذاکرہ کرتے تھے۔

اسمٰعیل ابنِ رجاء کا دستور تھا کہ جب کوئی نہ ملتا، تو مکتب کے لڑکوں کو اکٹھا کر کے اُن کے سامنے حدیثیں بیان کرتے تاکہ حدیث کی مشق میں ناغہ نہ ہو، اور بھولنے نہ پائیں۔

(دارمی ص۸۷، تہذیب التہذیب ص۲۹۶۔ ج۱)

حفظِ حدیث کے لیے صحابہ و تابعین اور اتباعِ تابعین کا یہ غیر معمولی اہتمام آپ نے ملاحظہ کیا۔ اس کے ساتھ اس تاریخی حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ قدرت کی طرف سے ان حضرات کو کس قدر حیرت انگیز قوتِ یادداشت اور غیر معمولی حافظے عطا ہوئے تھے جس کی نظیر آج مشکل سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ پس ان حالات اور واقعات کے باوجود یہ خیال قائم کر لینا کہ زبانی روایت پر دار و مدار ہونے کی وجہ سے حدیثیں کچھ سے کچھ ہوگئیں، انصاف کا خون یا تاریخی حقائق سے چشم پوشی اور محض وہم پرستی سے زائد وقیع نہیں، اور اِن حالات میں بلید الطبع انسان ہی احادیث کو تشریعی حیثیت سے نکالکر دوسری حیثیت اور تاریخ و اسرائیلیات میں شامل کر سکتا ہے

صحابہؓ و تابعینؒ کا غیر معمولی حافظہ

میں نے ابھی ابھی صحابہؓ و تابعین کی

حیرت انگیز قوتِ یادداشت کا جو ذکر کیا ہے، وہ محض خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں ہے بلکہ واقعات کی روشنی میں پوری ایمان داری کے ساتھ میں نے اس بات کو لکھا ہے۔ اسماء الرجال اور تذکرہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں پر تو میرے اس بیان کی صداقت آفتاب کی طرح روشن ہے لیکن جن کو یہ موقع نہیں ملا ہے ان کے اطمینان و تشفی کے لیے چند تاریخی واقعات نقل کیے جاتے ہیں :

۱ ــــــ صحابہ رضؓ میں حضرت ابو ہریرہ رضؓ کا نام کون نہیں جانتا مورخِ اسلام حافظ ذہبی کی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں خود ان ہی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم نے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ، تم مالِ غنیمت سے حصہ نہیں مانگتے۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپؐ سے علم کی دولت مانگتا ہوں۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے میری چادر میرے جسم سے اُتار کر بیچ میں پھیلا دی اور حدیثیں بیان کرنا شروع کیں، فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ چادر کو اپنے سینے سے لگا لو۔ مَیں نے ایسا ہی کیا، اس کے بعد میرا یہ حال ہو گیا کہ ایک حرف بھی آپؐ کی حدیث کا میں نہیں بھولتا تھا۔ (تذکرہ، ج ۱، صہ ۳۲)

۲ ــــــ تابعین میں ایک مشہور و معروف مفسّر اور حافظِ حدیث قتادہ رح ہیں۔ ان کی نسبت امام احمد بن حنبل رح فرماتے تھے کہ، قتادہ رح جو کچھ سُن لیتے ان کو یاد ہو جاتا۔ ان کے سامنے ایک دفعہ حضرت جابرؓ کا صحیفہ یعنی حضرت جابر رضؓ کی روایت کی ہوئی حدیثوں کا مجموعہ صرف ایک مرتبہ پڑھ دیا گیا اور اُن کو وہ پورا مجموعہ یاد ہو گیا۔ خود قتادہ رح کا بیان ہے کہ میں نے کبھی کسی اُستاد سے دُہرانے

کی خواہش نہیں کی، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی چیز میرے کان میں پڑے اور وہ میرے دل میں نہ بیٹھ جائے۔ (تذکرہ: ج ۱ ص ۱۱۶)

۳ــــــ ایک نہایت جلیل القدر تابعی امام شعبی رح ہیں۔ وہ ایک دن آنحضرت صلعم کے غزوات کے واقعات بیان کر رہے تھے۔ اتفاق سے حضرت عبداللہ بن عمر رض (صحابی) کا ادھر سے گزر ہوا اور انہوں نے شعبی رح کا بیان سنا تو فرمایا کہ باوجودیکہ میں ان غزوات میں خود شریک تھا لیکن شعبی رح کو مجھ سے زیادہ واقعات یاد ہیں اور وہ مجھ سے زیادہ باخبر ہیں۔ (تذکرہ: ص ۷۰)

ــــــ شعبی رح خود کہتے تھے کہ میں نے کبھی کوئی چیز نہیں لکھی، لیکن حافظہ ایسا ہے کہ کسی نے کوئی حدیث بیان کی تو اس کو بھولا بھی نہیں۔ اور یہ بھی نہیں ہوا کہ کبھی میں نے استاد سے دوبارہ بیان کرنے کی خواہش کی ہو۔ (تذکرہ: ص ۹، ج ۱)

یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے اشعار ہر چیز سے کم یاد ہیں، تاہم اگر میں تم کو اشعار سنانا شروع کردوں تو ایک مہینہ تک کوئی شعر مکرر نہیں سناؤں گا۔ (تذکرہ: ص ۷۹، ج ۱)

۴ــــــ ابوصالح معان کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اعمش نے ان سے ایک ہزار حدیثیں سنی تھیں، جیسا کہ خود اعمش کا بیان ہے۔ (تذکرہ: ص ۸۲، ج ۱)

۵ــــــ مکحول خود اپنی نسبت فرماتے تھے کہ میں نے جو چیز اپنے سینہ میں رکھ لی پھر جس وقت چاہا اس کو اپنے سینے میں موجود پایا۔

۶ــــــ زہری کا بیان ہے کہ میں نے جو علم اپنے سینہ میں رکھ لیا اس کو کبھی نہیں بھولا۔ (تذکرہ: ص ۱۰۳، ج ۱)

سعید کا بیان ہے کہ زہری سے ایک شخص نے حدیثیں لکھانے کی درخواست

کی' انہوں نے اس کو چار سو حدیثیں لکھوا دیں۔ ایک مہینہ کے بعد اس شخص سے پھر ملاقات ہوئی تو اس نے کہا وہ نوشتہ جس میں چار سو حدیثیں لکھی تھیں' کھو گیا۔ زہری نے دوبارہ وہ حدیثیں اس کو لکھوا دیں۔ جب اس نے دونوں نوشتوں کا مقابلہ کیا تو ایک حرف کا بھی فرق نہ تھا۔ (تذکرہ: ص ۱۰۴' ج ۱)

زہریؒ کے بھتیجے کا بیان ہے کہ زہریؒ نے صرف اسّی راتوں میں قرآن پاک یاد کر لیا تھا۔ خود امام زہریؒ کا بیان ہے کہ میں نے کسی حدیث کے متعلق کبھی دوبارہ بیان کرنے کے لیے استاد سے نہیں کہا' نہ کسی حدیث میں کبھی شک پیدا ہوا' صرف ایک دفعہ ایک حدیث میں شک ہوا تھا' مگر میں نے اس کی نسبت بھی اپنے ہم سبق سے پوچھا تو وہ اسی طرح تھی' جس طرح میں نے اس کو یاد کیا تھا۔ (تذکرہ: ص ۱۰۴)

تابعین کے بعد کے طبقے

صحابہ و تابعین کے بعد کے طبقوں میں بھی قوتِ یادداشت کی ایسی ہی فراوانی تھی۔ بلکہ ان طبقوں میں حافظہ کی بعض مثالیں پہلے سے بھی زیادہ حیرت انگیز ملتی ہیں۔

۱ــــــ مغیرہ ضبیؒ' تبع تابعی کے حافظہ کا حال خود ان کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ جو اُن کے کان میں پڑ گئی اس کو پھر کبھی نہیں بھولے۔ (تذکرہ: ص ۱۲۵' ج ۱)

۲ــــــ عمرو بن حارث مصریؒ۔ تبع تابعی کی نسبت' ابو حاتم رازیؒ کا قول ہے کہ وہ اپنے زمانے میں سب سے بڑے حافظ تھے۔ حافظہ میں ان کا ہمسر کوئی نہ تھا اور ابنِ وہبؒ کا بیان ہے کہ میں نے ان سے زیادہ قوی حافظہ کا انسان نہیں دیکھا۔

(تذکرہ: ص ۱۷۳' ج ۱)

۳ ـــــ معمرؒ تبع تابعی کا بیان ہے کہ میں نے چودہ برس کی عمر میں قتادہؒ سے حدیثیں سنی تھیں، جو کچھ اس وقت سُنا تھا آج تک ایسا معلوم ہوتا ہے میرے سینے میں لکھا ہوا ہے۔ (تذکرہ: ص ۱۹۱، ج ۱)

۴ ـــــ شعبہؒ تبع تابعی کو اتنی کثرت سے حدیثیں یاد تھیں کہ ابوداؤد طیالسیؒ نے ان سے سات ہزار حدیثیں سُنی تھیں اور غندرؒ نے بھی اتنی ہی حدیثیں ان سے سُنی تھیں۔ شعبہؒ کا خود اپنا بیان ہے کہ صرف ایک ابوالزبیرؒ سے سُنی ہوئی مجھ کو سو حدیثیں ازبر ہیں۔

۵ ـــــ حمّاد بن سلمہؒ تبع تابعی کے پاس قیس بن سعدؒ کی مرویات کے سوا کوئی حدیث لکھی ہوئی نہ تھی۔ بایں ہمہ یحییٰ بن الفریسؒ کے پاس حمادؒ سے سُنی ہوئی دس ہزار حدیثیں تھیں۔ اور عمرو بن عاصمؒ کا بیان ہے کہ میں نے حمّادؒ سے دس ہزار سے بھی زیادہ حدیثیں سُن کر لکھی ہیں۔

(تذکرہ: ص ۲۹۰، ج ۱)

۶ ـــــ سفیان ثوریؒ کا بیان ہے، میں نے اپنے سینے کو (احادیث کی) جو امانت بھی سُپرد کی، اس نے کبھی خیانت نہیں کی۔ یحییٰ قطانؒ کا بیان ہے کہ میں نے سفیانؒ سے زیادہ حدیث کا حافظ نہیں دیکھا۔

۷ ـــــ اسرائیل کا بیان ہے کہ میں ابواسحاقؒ کی مرویات کو اس طرح یاد رکھتا تھا جیسے قرآن کی سورتوں کو۔

۸ ـــــ ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ دہیبؒ اپنی یاد سے حدیثیں لکھواتے تھے۔ (تذکرہ: ص ۲۱۷، ج ۱) باوجودیکہ ان کی روایات بہت زیادہ ہیں۔

۹ــــ ہیثمؒ کے پاس بیس ہزار حدیثیں تھیں۔ ابن مہدیؒ کا بیان ہے کہ وہ سفیان ثوری سے بھی بڑھ کر حافظِ حدیث تھے۔ (ثوریؒ کا حال پچھلے صفحہ پر آپ پڑھ چکے ہیں)۔ (تذکرہ: ص ۲۲۹، ج ۱)

۱۰ــــ داؤد ضبیؒ کا بیان ہے کہ اسماعیل بن عیاشؒ کے ہاتھ میں کبھی میں نے کتاب نہیں دیکھی، وہ اپنی یاد سے حدیثیں سناتے تھے اور ان کو تیس ہزار حدیثیں یاد تھیں۔ (تذکرہ: ص ۲۲۴، ج ۱)

۱۱ــــ ابن عیینہؒ کے پاس سات ہزار کے قریب حدیثیں تھیں اور ان سبکو وہ اپنی یاد سے بیان کرتے تھے۔ (تذکرہ: ص ۲۴۲، ج ۱)

۱۲ــــ ابن المبارکؒ کے والد ایک دفعہ اُن پر خفا ہوئے اور کہا کہ تیری کتابیں مجھے مل گئیں تو جلا دوں گا۔ ابن المبارکؒ نے کہا کہ اس سے کیا ہو جائیگا، وہ سب تو میرے سینے میں ہیں۔ علی بن الحسن بن شفیقؒ کا بیان ہے کہ ایک رات ابن المبارکؒ مسجد سے نکلے، میں بھی ساتھ ہو لیا۔ دروازہ پر انہوں نے حدیث کا ذکر چھیڑ دیا۔ مذاکرہ کا سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ جب فجر کی آذان کے لیے موذن آیا تو ہم مذاکرہ ہی میں مشغول تھے۔ (تذکرہ ص ۲۵۵، ج ۱)

۱۳ــــ عیسیٰ بن یونسؒ کو اپنی حدیثیں اس قدر یاد تھیں کہ فرماتے تھے اگر میری کتاب میں کہیں ایک واؤ بھی کوئی بڑھا دے تو وہ مجھ سے چھُپ نہیں سکتا۔

(تذکرہ: ص ۲۵۹، ج ۱)

۱۴ــــ یحییٰ بن الیمانؒ کو ایک مجلس میں پانچ سو حدیثیں یاد ہو جاتی تھیں۔

(تذکرہ: ص ۲۶۳، ج ۱)

۱۵ ـــــ ابوؔمعاویہؒ نابینا تھے اس کے باوجود علی ابن المدینیؒ کا بیان ہے کہ میں نے ان سے ڈیڑھ ہزار حدیثیں سُن کر لکھی ہیں۔ جریرؒ کا بیان ہے کہ ہم اعمشؒ کے پاس سے حدیثیں سُن کر اُٹھتے تھے تو باہم مذاکرہ کرتے تھے۔ ہم سب میں ابوؔمعاویہؒ (نابینا) سے زیادہ کسی کو یاد نہ ہوتا تھا۔ خود ابوؔمعاویہؒ کا بیان ہے کہ آنکھ والے لوگ اعمشؒ کی مجلس میں میرے محتاج تھے اور ان کی ساری سُنی ہوئی حدیثیں بول دیتا تھا اور وہ لکھ لیتے تھے۔ (تذکرہ: ص ۲۷۱، ج ۱)

۱۶ ـــــ مرؔوان ابنِ معاویہؒ کو اپنی کُل حدیثیں یاد تھیں۔ (تذکرہ: ص ۲۷۱، ج ۱)

۱۷ ـــــ ابنِ معینؒ کا بیان ہے کہ حفص بن غیاث نے بغداد اور کوفہ میں جتنی حدیثیں بیان کی ہیں، وہ سب اپنی یادداشت سے بیان کی ہیں، کتاب کبھی نہیں نکالی اور تین چار ہزار حدیثیں ان کی یاد سے لوگوں نے لکھی ہیں۔ (تذکرہ: ص ۲۷۴، ج ۱)

۱۸ ـــــ ابنِ مہدیؔ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ سفیاؔنؒ نے مجھ سے کہا کہ کسی محدّث کو مذاکرہ کرنے کے لیے میرے پاس لاؤ۔ میں یحییٰ قطانؒ کو ساتھ لے گیا۔ سفیاؔنؒ نے ان سے مذاکرہ کیا تو ہکّا بکّا رہ گئے۔ (تذکرہ: ص ۲۷۶، ج ۱)

۱۹ ـــــ ولیؔد بن مسلمؒ کو بڑی لمبی لمبی حدیثیں اور ملاحم کی پیشین گوئیوں والی روایتیں خوب یاد تھیں ـــــ ابواب بھی ان کو ازبر تھے۔

(تذکرہ: ص ۲۷۹، ج ۱)

۲۰ ـــــ احمدؔ ابن صالحؒ کا بیان ہے کہ ابن وہبؒ نے ایک لاکھ حدیثیں بیان کی ہیں۔ (تذکرہ: ص ۲۸۰، ج ۱)

۲۱ ـــــ اماؔم احمدؒ کا قول ہے کہ میں نے وکیعؒ سے بڑھ کر کسی کو حافظ نہیں پایا۔

ابوحاتمؒ فرماتے ہیں کہ وکیعؒ ابن المبارکؒ سے بھی بڑھ کر حافظ تھے۔

ابوداؤدؒ کا بیان ہے کہ وکیعؒ کے ہاتھ میں حدیث بیان کرنے کے وقت کبھی کتاب نہیں دیکھی گئی۔ (تذکرہ: ص ۲۸۲، ج ۱)

۲۲ ـــــ وکیعؒ کا بیان ہے کہ محاربیؒ لمبی حدیثوں کے بڑے حافظ تھے۔

(تذکرہ: ص ۲۸۰، ج ۱)

۲۳ ـــــ یزید بن ہارونؒ کا خود اپنی نسبت یہ گمان ہے کہ مجھ کو چوبیس ہزار حدیثیں سند کے ساتھ یاد ہیں اور وہ بھی اتنی پکی کہ ان میں کوئی ایک حرف بھی ملا دے تو جان لوں۔ زیاد ابن ایوبؒ کا بیان ہے کہ میں نے یزیدؒ کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی' (تذکرہ: ص ۲۹۲، ج ۱)

۲۴ ـــــ زیاد ابنِ ایوبؒ کا بیان ہے کہ ابنِ علیہؒ کے ہاتھ میں' میں نے کبھی کتاب نہیں دیکھی۔ ابوداؤدؒ کا بیان ہے کہ ابنِ علیہؒ سے حدیث میں کبھی بھول چوک نہیں ہوئی۔ (تذکرہ: ص ۲۹۶، ج ۱)

۲۵ ـــــ قواریریؒ کا بیان ہے کہ ابنِ مہدیؒ نے بیس ہزار حدیثیں اپنی یاد سے مجھے لکھوائیں۔ ذہلیؒ فرماتے ہیں کہ ابنِ مہدیؒ کے ہاتھ میں میں نے کتاب کبھی نہیں دیکھی۔ (تذکرہ: ص ۳۰۲ و ۳۰۳، ج ۱)

۲۶ ـــــ محمد بن عبید طنافسیؒ کی حدیثیں چار ہزار تھیں اور سب ازبر تھیں۔

(تذکرہ: ص ۳۰۵، ج ۱)

۲۷ ـــــ ابوداؤد طیالسیؒ کی یاد سے لوگوں نے چالیس ہزار حدیثیں لکھیں۔

(تذکرہ: ص ۳۲۱، ج ۱)

۲۸ ـــــ ابوٓاحمد زبیریؒ کے پاس سفیان ثوریؒ کی احادیث کا بہت بڑا مجموعہ تھا۔ فرماتے تھے کہ وہ مجموعہ چوری ہو جائے تو مجھ کو اس کی کچھ پرواہ نہیں، وہ سارے کا سارا مجموعہ مجھ کو یاد ہے۔ (تذکرہ: ص ۲۲۵، ج ۱)

۲۹ ـــــ ابو عاصمؒ کو ایک ہزار حدیثیں یاد تھیں اور ہمیشہ اپنی یاد سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے۔ (تذکرہ: ص ۳۴۴، ج ۱)

۳۰ ـــــ علی بن الحسن بن شقیقؒ، ابن المبارکؒ کی کتابوں کے سب سے بڑے حافظ تھے۔ (تذکرہ: ص ۳۴۷، ج ۱)

۳۱ ـــــ سلیمان ابن حربؒ کی نسبت ابو حاتمؒ کا بیان ہے کہ ان کی حدیثوں میں سے دس ہزار حدیثیں ظاہر ہوئی ہیں اور میں نے ان کے ہاتھ کبھی کتاب نہیں دیکھی۔ (تذکرہ: ص ۳۵۵)

۳۲ ـــــ سعید ابن المنصور المتوفی ۲۲۷ھ نے دس ہزار حدیثیں اپنی یاد سے لکھائیں، جیسا کہ حرب کرمانیؒ کا بیان ہے۔ (تذکرہ: ص ۵، ج ۲)

۳۳ ـــــ ابو زرعہؒ کا بیان ہے کہ امام احمدؒ کو دس لاکھ احادیث یاد تھیں۔

۳۴ ـــــ ابو داؤد خفافؒ کا بیان ہے کہ اسحاق ابن راہویہؒ نے گیارہ ہزار حدیثیں اپنی یاد سے لکھوائیں، پھر اُن کو اپنی کتاب سے پڑھ کر سُنایا تو نہ کہیں ایک حرف بڑھا نہ گھٹا۔

۳۵ ـــــ امام بخاریؒ کے حافظہ کا حال حاشد بن اسماعیلؒ نے یوں بیان کیا ہے کہ بخاری ہمارے ساتھ حدیث سُننے کے لیے محدثین کی مجلسوں میں جایا کرتے تھے، تو لکھتے نہ تھے۔ بہت دنوں تک ہم یہی دیکھتے رہے، ان سے اس باب میں ہم کچھ کہتے

تو وہ خاموش رہتے۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ تم لوگ مجھ سے بہت کہتے رہے، لاؤ مجھ کو دکھاؤ، تم نے اب تک کتنی حدیثیں لکھی ہیں؟ ہم نے دکھایا تو پندرہ ہزار سے زائد حدیثیں تھیں۔ اس کے بعد ہماری بیاضیں انہوں نے ہم کو دے دیں اور ان حدیثوں کو اپنی یاد سے زبانی سُنانا شروع کیا تو کُل کی کُل سُنا دیں۔ انکی یادداشت اتنی درست تھی کہ ہم نے اُن کی یاد سے اپنی بیاضوں کی غلطیاں ٹھیک کیں۔ اس کے بعد بخاریؒ نے کہا کہ تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں اپنا وقت برباد کرنے کے لیے روزانہ آتا ہوں۔ (تذکرہ: ص ۱۲۳، ج ۲ اور مقدمہ فتح الباری: ص ۵۶۴)

خود امام بخاری رح فرماتے تھے کہ مجھ کو ایک لاکھ صحیح حدیثیں اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں۔ (تذکرہ: ص ۱۲۳، ج ۲۔ مقدمہ: ص ۵۷۵)

بخاریؒ کا یہ واقعہ بھی نہایت مشہور ہے کہ جب وہ بغداد گئے ہیں تو وہاں کے محدّثین نے متفق ہو کر ان کے حافظہ کا امتحان کرنا چاہا اور اس کی یہ صورت تجویز ہوئی کہ سو حدیثیں چھانٹ کر اُن کی اسناد و متن کو اُلٹ پلٹ کر دیا گیا۔ اُس کی سند اِس کے ساتھ اور اِس کی سند اُس کے ساتھ جوڑ دی گئی۔ پھر دس محدّث چُنے گئے اور ان میں سے ہر ایک کو دس دس حدیثیں دی گئیں کہ جب مجلس میں سب لوگ بہ اطمینان بیٹھ جائیں، تو ایک آدمی آگے بڑھ کر ایک حدیث تبدیل شدہ پڑھ کر امام بخاریؒ سے پوچھے کہ آپ کو یہ حدیث معلوم ہے؟ اسی طرح دسوں حدیثوں کو پڑھ کر پوچھتا جائے، جب وہ فارغ ہو جائے تو دوسرا آگے بڑھے۔ اسی طرح دسوں آدمی پوچھیں۔ یہ طے کر کے امام بخاری کو ایک مجلس میں دعوت دے کر بُلایا گیا اور ایک بہت بڑا مجمع کیا گیا۔ اِس مجمع میں طے شدہ تجویز کے مطابق جو

لوگ مقرر ہوئے تھے انہوں نے پوچھنا شروع کیا۔ بخاری نے ہر سوال کے جواب میں کہا، میں اس کو نہیں جانتا۔ جب وہ دسوں آدمی پوچھ چکے تو بخاریؒ نے سب سے پہلے پوچھنے والے کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ آپ نے پہلی حدیث یوں پڑھی ہے حالانکہ وہ اس طرح ہے، اور دوسری حدیث کی سند یہ بیان کی ہے، حالانکہ اس کی سند یوں ہے۔ اسی طرح فرداً فرداً ترتیب کے ساتھ ہر حدیث کی سند و متن کی صحیح نسبت بیان کر گئے۔ اس وقت لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کے بے مثال حافظہ کے قائل ہو گئے۔ (مقدمہ: ص ۴۷۵)

۳۶ ـــــ امام ترمذیؒ کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ مکّہ کے راستے میں ان کو معلوم ہوا کہ فلاں محدّث آرہے ہیں، ترمذی نے اس سفر سے پہلے ان محدّث کی روایت کی ہوئی حدیثیں کسی شخص سے لے کر نقل کریں اور ان کا خیال تھا کہ وہ اجزاء ان کے پاس موجود ہیں اس لیے چاہا کہ ان محدّث سے وہ اجزاء سُن کر باقاعدہ سماع حاصل کریں۔ لیکن تلاش کیا تو وہ اجزاء سفر میں ساتھ نہ تھے۔ دل نے گوارا نہ کیا کہ یہ سنہری موقعہ ہاتھ سے چلا جائے۔ اس لیے ایک سادی بیاض ہاتھ میں لے کر اس محدّث کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ، آپ کی کچھ مرویات میں نے ایک شخص سے لے کر نقل کی ہیں۔ آپ اپنی زبان سے ان حدیثوں کو سُنا دیجئے۔ انہوں نے قبول کر لیا۔ ترمذیؒ وہی سادی بیاض ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئے اور محدّث نے وہ حدیثیں اپنی یاد سے سُنانا شروع کیں۔ اتفاق سے محدّث کی نظر بیاض پر جا پڑی، دیکھا تو وہ سادی تھی۔ محدّث نے خفا ہو کر کہا، تم کو مجھ سے شرم نہیں آتی؟ ترمذیؒ نے اس کے جواب میں قصہ سُنایا، اور کہا اگرچہ وہ اجزاء ساتھ نہیں ہیں، مگر اس میں کی سب حدیثیں مجھ کو زبانی یاد

ہیں۔ محدّث نے کہا، اچھا سناؤ۔ ترمذیؒ نے مسلسل تمام حدیثیں سُنا دیں۔ محدّث نے پوچھا کہ تم نے ان کو رٹ لیا تھا؟ ترمذی نے جواب دیا، نہیں پھر کہا، آپ ان کے علاوہ دوسری حدیثیں سُنا کر بھی امتحان کر لیجئے۔ چنانچہ محدّث نے اپنی مخصوص چالیس حدیثیں سُنا کر ان سے کہا کہ اب یہ حدیثیں تم سُناؤ۔ ترمذیؒ نے اسی وقت اوّل سے آخر تک سُنا دیں۔ وہ محدّث محوِ حیرت ہو گئے اور فرمایا۔ "میں نے تم جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا"۔ (تہذیب التہذیب: ص ۳۸۶، ج ۹۔ تذکرہ — ص ۱۸۸، ج ۲)

۴۷ —— ایک شخص ابوزرعہؒ کے پاس آیا اور کہا کہ میرے مُنہ سے یہ نکل گیا ہے کہ اگر ابوزرعہؒ کو ایک لاکھ حدیثیں یاد نہ ہوں، تو میری بیوی کو طلاق۔ ابوزرعہؒ نے کہا، تمہاری بیوی مطلقہ نہیں ہوئی (یعنی مجھ کو اتنی حدیثیں یاد ہیں)

(تذکرہ: ص ۱۰۴، ج ۲)

ابوزرعہؒ فرماتے تھے کہ ایک لاکھ حدیثیں مجھ کو اس طرح یاد ہیں جیسے کسی کو قل ہو اللہ الخ یاد ہوتی ہے۔ (تہذیب: ص ۳۳، ج ۷)

نیز فرماتے تھے کہ میں نے اپنے ہاتھ سے جو دفتر حدیثوں کے لکھے ہیں، ان میں سے بعض کو لکھے ہوئے پچاس برس ہو چکے ہیں اور اس وقت سے آج تک پھر اس کو دیکھا بھی نہیں ہے۔ بایں ہمہ میں ہر حدیث کی نسبت جانتا ہوں کہ وہ کس کتاب میں، کس ورق میں، کس صفحہ میں اور کس سطر میں ہے۔ (تہذیب: ص ۳۳)

۴۸ —— ابوالليثؒ کا اپنی نسبت بیان ہے کہ مجھ کو دس ہزار غیر مکرّر حدیثیں یاد ہیں۔ (تذکرہ: ص ۱۲۹، ج ۱)

۳۹ ـــــ ابنِ عاصمؒ کی کتابیں ایک ہنگامہ میں ضائع ہوگئیں تو انھوں نے اپنے حافظہ سے پچاس ہزار حدیثیں لکھ لیں۔ (تذکرہ: ص ۱۹۴، ج ۲)

۴۰ ـــــ خطیبؒ کا بیان ہے کہ جزرۃؒ ایک مدت تک اپنی یاد سے حدیثیں بیان کرتے رہے، اس لیے کہ کوئی کتاب ساتھ نہیں لی تھی۔

(تذکرہ: ص ۱۹۵، ج ۲)

مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ واقعات پڑھتے پڑھتے آپ گھبرا گئے ہوں گے۔ اس لیے اتنی ہی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ اس موضوع پر تو ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ آپ غور فرما لیجیے کہ صحابہ رضؓ اور تابعینؒ اور تبع تابعینؒ اور محدثینؒ کا یہ شغف اور عمریں گنوانا کیا تاریخی واقعات رٹ لینے کا باعث تھا یا اعلیٰ درجہ کی اطاعت سمجھ کر اور تشریعی حیثیت اور جوشِ ایمانی کی وجہ سے تھا اور ان سب کو کذّاب و مفتری و مجنون کہنا اپنے جنون پر دلیل قائم کرنا ہے ـــــ

روایت میں محدثین کی بےنظیر احتیاط

اِس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے، وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اپنی حدیثوں کی اشاعت و تبلیغ کے لیے بڑی بڑی تاکیدیں کی ہیں، وہاں اس کی بھی نہایت سخت تاکید کی ہے کہ کوئی غلط بات آپ کی طرف منسوب نہ ہونے پائے۔ اس لیے ابتداء ہی سے محدثین کا گروہ حدیثوں کی روایت کرنے میں بے حد محتاط رہا ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ رضؓ اس ڈر سے کہ بیان کرنے میں کچھ کمی بیشی نہ ہو جائے، بہت کم حدیثیں بیان کرتے تھے جیسا کہ

حضرت زبیر رضؓ کا واقعہ صحیح بخاری جلد ا صفحہ ۲۱ میں مذکور ہے۔ حضرت انس رضؓ کا یہ حال تھا کہ جس حدیث میں ان کو ذرا بھی شبہہ ہو جاتا کہ یہ حدیث خوب اچھی طرح یاد نہیں ہے تو وہ اس کو بیان نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ غلطی کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں بیان کرتا۔ (دارمی، صہ ۴۶)

امام ربانی محمد باقرؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن عمر رضؓ کو سب سے زیادہ اس بات کا اہتمام تھا کہ حدیث میں ذرّہ برابر بھی کوئی کمی بیشی نہ ہو۔ (تذکرہ، صہ ۳۷) چنانچہ صحیح مسلم جلد ا صفحہ ۳۲ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عمر رضؓ نے یہ حدیث بیان کی کہ "بنی الاسلام علی خمس شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ و ان محمدا رسول اللہ واقام الصلوٰۃ و ایتاء الزکوٰۃ وصیام رمضان والحج"

حضرت ابن عمر رضؓ کے بیان کرنے کے بعد مجلس میں کسی شخص نے اس حدیث کو دُہرایا تو یوں کہہ دیا والحج وصیام رمضان۔ حضرت ابن عمر رضؓ نے فوراً اس کو ٹوکا اور فرمایا، یوں نہیں بلکہ "وصیام رمضان والحج" میں نے رسول اللہ صلعم سے اسی طرح سُنا ہے۔ غور فرمایئے کہ باوجودیکہ معنیٰ میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی تھی، پھر بھی جس ترتیب سے حدیث کے الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنتے تھے، اس میں یہ معمولی سا تغیر بھی ان کو گوارا نہ تھا۔

دارمی کے صفحہ ۷۱ میں عبداللہ بن عمر رضؓ کا ایسا ہی دوسرا واقعہ ایک دوسری حدیث کے باب میں مذکور ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی نسبت تذکرۃ الحفاظ میں مذکور ہے:

کان ممن یتحری فی	یعنی "ان کا شمار ان حضرات میں سے
الاداء و لیشدد	ہے جو ادائے حدیث میں بے حد
فی الروایۃ و ینجر	احتیاط اور روایت کے بارے میں بڑا
تلامذتہ عن التھاون	تشدد برتتے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو
وضبط الالفاظ۔	الفاظِ حدیث کے ضبط کرنے میں سستی
(ج ۱ ص ۱۳)	پر بہت ڈانٹتے تھے۔"

امام مالکؒ کا یہ حال تھا کہ وہ "یا" اور "تا" کا بھی خیال رکھتے تھے۔ یعنی خطاب و غیبت کا۔ (تذکرہ: جلد ۱، ص ۱۹۸)

حضرت زید ابنِ ارقم رضؓ کا جب بڑھاپا آیا، اُس وقت کوئی شخص حدیث بیان کرنے کو کہتا تو فرماتے کہ اب ہم بوڑھے ہو گئے اور آنحضرت صلعم کی حدیث بیان کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ (ابنِ ماجہ، ص۲)

اسی احتیاط کا تقاضا تھا کہ حضرت ابنِ عمر رضؓ اپنے شاگردوں کو ہدایت کیا کرتے تھے کہ جب تم حدیث کی روایت کرنے کا ارادہ کرو تو پہلے تین دفعہ اس کو دہرالیا کرو۔ (دارمی ص۴۸)

نیز اسی شدتِ احتیاط ہی کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضؓ و عمر رضؓ کی بڑی تاکید تھی کہ حضور صلعم سے حدیثوں کی روایت کم کی جائے۔

صحابۂ کرام رضؓ کے یہ واقعات پڑھنے کے بعد آپ ہی انصاف سے کہیئے کہ جس جماعت کو اس درجہ ضبط و احتیاط کا پاس و لحاظ ہو اس کی نسبت یہ خیال قائم کرنے کا تو کسی درجہ میں امکان ہی نہیں کہ اس نے جان بوجھ کر غلط

تو درکنار کوئی مشکوک بات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی ہوگی۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ جب احتیاط کا یہ عالم تھا اور حدیثوں کی روایت سے بھی چارۂ کار نہ تھا تو لازمی طور پر حدیثوں کو یاد رکھنے اور ان کو بعینہٖ حافظہ میں محفوظ رکھنے کا انتہائی اہتمام ہوگا۔ اس حالت میں بھول چوک سے حدیثوں کا کچھ سے کچھ ہونا بعید از قیاس ہے۔ خصوصاً جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ شروع ہی سے اس کا بھی اہتمام تھا کہ ایک شخص کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو مزید اطمینان کے لیے کوئی دوسرا اس کا مؤید تلاش کیا جاتا تھا۔ جیساکہ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱، ص۲ میں مذکور ہے کہ جب حضرت مغیرہؓ نے یہ بیان کیا کہ آنحضرت صلعم نے دادی کو پوتے کی میراث کا چھٹا حصہ دلوایا ہے تو حضرت ابوبکرؓ نے ان سے دریافت کیا کہ کوئی اور بھی آنحضرتؐ سے اس بات کو نقل کرنے میں تمہارا شریک ہے؟ معلوم ہوا کہ حضرت محمد ابن مسلمہؓ بھی اس کو جانتے ہیں، چنانچہ انہوں نے آکر شہادت دی تو حضرت ابوبکرؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ کیا۔ اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ سے ایک حدیث بیان کی تو انہوں نے حکم دیا کہ اس پر کوئی دوسری شہادت پیش کرو۔ حضرت ابوموسیٰؓ انصار کے مجمع میں گئے اور ان سے پوچھا کہ آپ لوگوں میں سے کسی نے آنحضرتؐ سے فلاں حدیث سنی ہے؟ انہوں نے کہا، ہم سب نے یہ حدیث سنی ہے۔ حضرت ابوموسیٰؓ نے ان میں سے ایک انصاری کو ساتھ لیا اور حضرت عمرؓ کے سامنے ان کی شہادت دلوائی۔ (تذکرہ: ص ۶)

خود حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ ایک حدیث کو بیان کرنا شروع کیا تو

فرمایا کہ ڈر تو لگتا ہے کہ کوئی کمی بیشی نہ ہو جائے، لیکن عمار رضؓ نے بھی میرے ساتھ اس حدیث کو سُنا ہے اس لیے میں بیان کرتا ہوں، تم عمار رضؓ کے پاس آدمی بھیج کر ان سے تصدیق کرالو۔ چنانچہ عمار رضؓ کو بُلا کر پوچھا گیا تو انہوں نے حضرت عمر رضؓ کے بیان کی تصدیق و تائید کی۔ (ابو داؤد طیالسیؒ)

صحابۂ کرام رضؓ نے کس حزم و احتیاط کے ساتھ ہم تک احادیث کو پہنچایا؟

صحابۂ کرام رضؓ روایت حدیث میں نہایت حزم و احتیاط سے کام لیتے تھے۔ بعض صحابہ رضؓ مثلاً حضرت زبیر رضؓ سرے سے روایت ہی نہیں کرتے تھے۔ ایک بار ان سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضؓ نے پوچھا کہ آپ تمام صحابہ رضؓ کی طرح روایت کیوں نہیں کرتے؟ بولے اگرچہ رسول اللہ صلعم سے مجھ کو امتیاز اور خصوصیت حاصل تھی، تاہم میں نے آپؐ سے سُنا ہے کہ "جو شخص میری طرف جھوٹ کا انتساب کرے اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیئے"۔ (ابو داؤد)

بعض صحابہ برسوں قال الرسول کے لفظ سے قصداً اپنے لبوں کو آشنا نہیں کرتے تھے۔ امام شعبیؒ کا بیان ہے کہ میں ایک سال تک حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کے پاس بیٹھا، لیکن انہوں نے کوئی حدیث نہیں بیان کی، حضرت سائب بن یزید رضؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت طلحہ بن عبداللہ، حضرت سعدؓ، حضرت مقدادؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف رضؓ کی رفاقت کی، لیکن میں نے ان کی زبان سے ایک حدیث بھی نہیں سُنی۔

بعض لوگ صحابۂ کرام سے روایت کی درخواست کرتے تھے لیکن وہ انکار کر دیتے یا ٹال دیتے تھے۔ ایک بار لوگوں نے حضرت زید بن ارقم رضؓ سے کہا کہ حدیث بیان فرمایئے! بولے کہ ہم لوگ بوڑھے ہوئے اور بھول گئے۔ حدیث کی روایت کرنا تو نہایت سخت کام ہے۔

ایک بار لوگوں نے حضرت انس بن مالک رضؓ سے روایتِ حدیث کی درخواست کی، تو فرمایا کہ انشاء اللہ۔ (بخاری)

جو صحابہ رضؓ روایت کرتے تھے، وہ بھی نہایت کم حدیثیں بیان کرتے تھے۔ حضرت انس بن مالک رضؓ فرماتے تھے کہ کثرتِ روایت سے مجھے یہ حدیث روکتی ہے "من کذب علی متعمدا الخ" (بخاری)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ مہینے میں صرف دو یا تین حدیثوں کی روایت کرتے تھے۔ (دارمی)

حضرت عمر رضؓ لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ کثرتِ روایت سے روکتے تھے۔

حضرت قرظہ بن کعبؓ کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے ہم کو عراق بھیجا تو ہماری مشایعت کی اور کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں کیوں تمہارے ساتھ چلتا ہوں؟ سب نے کہا یہ ہماری عزت افزائی ہے۔ بولے، ہاں! لیکن تم ایسی قوم کے پاس جارہے ہو جو تلاوتِ قرآن میں شہد کی مکھیوں کی طرح ترنم ریز ہے۔ پس ان کی تلاوت میں خلل انداز نہ ہونا اور رسول اللہ صلعم کی حدیثیں بہت کم بیان کرنا، اور میں تمہارا شریک رہوں گا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

صحابۂ کرام رضہ جب بیان کرتے تھے تو روایت کی ذمہ داری سے گھبرا اُٹھتے تھے۔

حضرت عمرو بن میمونؒ ایک تابعی تھے، اُن کا بیان ہے کہ میں ہر جمعرات بلاناغہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، لیکن ان کی زبان سے کبھی قال رسول اللہ کا لفظ نہیں سُنا۔ ایک دن یہ الفاظ ان کی زبان سے نکلے تو گردن جُھکا لی۔ میں نے دیکھا تو ان کی قمیض کے تکمے کُھلے ہوئے تھے آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، گردن کی رگیں پھول گئی تھیں۔ حدیث کی روایت کرتے تھے تو احتیاطاً کہتے جاتے تھے، اس سے کم یا اس سے زیادہ، اس کے قریب یا اس کے مشابہ۔ یعنی یقینی طور پر یہ نہیں کہتے تھے کہ یہی الفاظ ہیں (ابو داؤد)

حضرت انس بن مالک رضہ جب حدیث بیان کرتے تھے تو گھبرا اُٹھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ الفاظ ہیں یا جیسا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہوگا۔ (دارمی)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ میں جب حدیث بیان کروں تو مجھے یہ گوارا ہے کہ مجھ پر آسمان پھٹ پڑے، بہ نسبت اس کے کہ آپکی طرف اس حدیث کا انتساب کروں جس کو آپ نے نہیں فرمایا۔ (مسلم)

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی نہدؓ ایک صحابی تھے وہ اپنے بستر پر ایک چھڑی رکھ کر بیٹھتے تھے۔ جب ان کے لڑکے اور بھتیجے علم حدیث کی تعلیم کے لیے آتے اور کہتے کہ "قال رسول اللہ ص" تو چھڑی اُٹھا کر فرماتے کہ تم رسول اللہ صلعم سے کیونکر روایت کر سکتے ہو؟ (اُسد الغابہ)

صحابۂ کرام رضؓ جس حزم و احتیاط کے ساتھ روایت کرتے تھے' اسی حزم و احتیاط کے ساتھ ان کو قبول بھی کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب میرے سامنے کوئی صحابی روایت کرتے ہیں تو میں ان سے قسم لیتا ہوں' جب وہ قسم کھا لیتے ہیں تو میں اس روایت کی تصدیق کرتا ہوں۔ (ابو داؤد)

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نہایت نرم خو تھے' لیکن روایت کے قبول کرنے میں کسی قسم کی مداہنت نہیں کرتے تھے۔ ایک بار دادی کی میراث کے متعلق حضرت مغیرہ بن شعبہ رضؓ نے ایک روایت کی' تو فرمایا کہ شاہد لاؤ۔ حضرت محمد بن مسلمہ رضؓ نے شہادت دی تو اس کو قبول کیا۔ (ابو داؤد)

تمام صحابہ رضؓ میں حضرت عمر رضؓ سب سے زیادہ متشدد فی الحدیث تھے' ایک بار زدوکوب میں کسی عورت کا حمل ساقط ہو گیا۔ تو حضرت عمر رضؓ نے اس کی دیت کے متعلق صحابہ رضؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام یا ایک لونڈی اس کی دیت میں دلوائی ہے۔ حضرت عمر رضؓ نے اس حدیث پر شہادت طلب فرمائی تو حضرت محمد بن مسلمہ رضؓ نے شہادت دی۔ (ابو داؤد)

ایک بار ابو موسیٰ اشعری رضؓ حضرت عمر رضؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ابو موسیٰ اجازت چاہتا ہے' اشعری اذن چاہتا ہے' عبد اللہ بن قیس استیذان کا خواستگار ہے۔ تین بار کی اذن طلبی پر بھی جب باریابی کی اجازت نہ ملی تو واپس آئے۔ حضرت عمر رضؓ نے بلا کر پوچھا' کیوں واپس چلے گئے؟ بولے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ' اگر تین بار میں اذن نہ ملے تو واپس چلے آؤ!!

فرمایا، اس حدیث پر گواہ لاؤ۔ حضرت ابوسعید خدری نے شہادت دی، تو کہا کہ میں تم کو متہم کرنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ تشدد صرف اس خوف کی بنا پر تھا کہ لوگ جھوٹی روایتوں کے کرنے پر دلیر نہ ہو جائیں۔ لیکن حضرت اُبی رضؓ نے اس تشدد کو دیکھ کر کہا: "عمرؓ! اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کا عذاب نہ بنو۔" (بخاری)

ایک بار حضرت عمرو بن امیہ رضؓ بازار میں چادر خرید رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا، کیا کرو گے؟ بولے، اس کو صدقہ میں دوں گا۔ حضرت عمر رضؓ نے بھی یہ بات سنی اور چلے گئے، بعد میں ملے تو کہا کہ وہ چادر کیا ہوئی؟ انہوں نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو صدقہ میں دیدی، کیونکہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ بیوی کو جو کچھ دو گے وہ صدقہ ہو گا۔ بولے، عمرو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر افترا نہ کرو، چنانچہ ان کو حضرت عائشہ رضؓ کے پاس لائے اور اس حدیث کی تصدیق کرائی۔
(ابو داؤد طیالسیؒ)

ایک بار حضرت ابومسعود رضؓ، حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ کو اسی تشدد کی بنا پر قید کر دیا اور کہا، یہ حدیثیں روایت کرتے ہیں! (المعتصر للمختصر)

ایک بار کسی نے حضرت ابوہریرہ رضؓ سے پوچھا کہ عہدِ عمر میں بھی تم اسی طرح حدیثوں کی روایت کر سکتے تھے؟ بولے، اگر ایسا کرتے تو کوڑے کھاتے۔
(تذکرۃ الحفاظ)

رہا یہ امر کہ حضرت عمر رضؓ نے ابومسعود رضؓ و ابوالدرداء رضؓ وغیرہما کو کیوں قید کر لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عمر رضؓ کا یہ مذہب تھا کہ احادیث انہی

الفاظ سے روایت کی جائیں جن الفاظ میں آنحضرت صلعم کی زبانی معلوم ہوئی تھیں چونکہ کثرتِ روایت سے اس امر کا التزام جس طرح چاہیئے نہیں ہو سکتا تھا اس لیے تکثیرِ روایت پر یہ لوگ قید کر لیے گئے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر رض کا یہ قول کہ لو لا انی اکرہ ان ازید فی الحدیث او انقص لحدثتکم (اگر حدیث میں زیادتی و نقصان کو مکروہ نہ جانتا تو خوب احادیث روایت کرتا)

اس پر شاہد صادق ہے' اس لیے کہ جب روایت حدیث کی باللفظ نہ ہو بلکہ بالمعنیٰ ہو تو ضرور الفاظ میں کمی بیشی ہو ہی جائے گی۔ چونکہ حضرت عمر رض کو روایت بالمعنیٰ سے سخت انکار تھا' اس لیے بڑے بڑے صحابہ ہیبت کی وجہ سے کثرتِ روایت کی جرأت نہیں کر سکتے تھے' چنانچہ حضرت ابوہریرہ رض سے ابوسلمہ رض نے دریافت کیا تھا کہ آپ حضرت عمر رض کے زمانے میں اسی طرح حدیثیں روایت کیا کرتے تھے؟ بولے نہیں' ورنہ درّے مارے جاتے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت عمر رض کے تشدّد سے گو حدیثیں کم روایت کی گئی تھیں مگر شبہات و شکوک سے بے لوث تھیں۔

گو حضرت عمر رض روایت بالمعنیٰ کو اور ہر ایک حدیث کو بلا تحقیق آنحضرت صلعم کی جانب منسوب کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے مگر ہرگز اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ حضرت عمر رض نفسِ حدیث اور مطلق حدیث کو بُرا سمجھتے تھے اور حجت نہ سمجھتے تھے۔ اگر ایک شخص میز پر بیٹھ کر کھانے کو پسند نہ کرتا ہو تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ مطلق کھانے ہی کو پسند نہیں کرتا؟

اس قسم کے نتائج وہی شخص نکال سکتا ہے جس کے دماغی قویٰ حریّت اور آزادی کی اہمیّت سے بالکل بے کار ہو چکے ہوں۔ غرض ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما

حدیث کو حجت مانتے اور بعد قرآن کے حدیث کو معتبر سمجھنے میں اصلاً متأمل نہ تھے۔

اس تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمر رضؓ کے زمانے میں روایتیں اسقدر منقح ہو گئی تھیں کہ حضرت امیر معاویہؓ نے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ صرف حضرت عمرؓ کے زمانے کی حدیثیں جمع کی جائیں، کیونکہ وہ لوگوں کو مذہبی معاملات میں ڈرایا کرتے تھے۔ (مسلم)

صحابہؓ کے پاس حدیث کا تحریری ذخیرہ

صحابۂ کرام رضؓ اگرچہ اکثر زبانی روایتیں کرتے تھے تاہم ان کے پاس بعض تحریری ذخیرے بھی موجود تھے۔ ان تمام مکتوبات و ذخائر کی تفصیل یہ ہے:

۱ ـــــ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضؓ نے حدیثیں جمع کرکے اس مجموعہ کا نام صادقہ رکھا، جس میں ایک ہزار حدیثیں تھیں۔ (بخاری، اصابہ، طبقات ابنِ سعد)

۲ ـــــ حضرت علی رضؓ نے حدیثیں لکھی تھیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ ہم نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس صحیفہ اور قرآن مجید کے سوا کچھ نہیں لکھا۔

(ابو داؤد، کتاب الحدود)

۳ ـــــ حضرت انس رضؓ نے حدیثیں لکھی تھیں۔ (بخاری، تدریب الراوی)

۴ ـــــ تحریری احکام اور معاہداتِ حدیبیہ اور وہ فرامین جو حضورؐ نے قبائل کو بھیجے تھے۔ (ابن ماجہ، طبقات ابنِ سعد)

۵ ـــــ وہ دعوتی نامہ جات جو آں حضرت صلعم نے سلاطین و امراء کے نام ارسال فرمائے تھے۔ (بخاری، تذکرۃ الحفاظ)

۶۔۔۔۔۔ فہرستِ اصحاب جن میں پندرہ سو ۱۵۰۰ اصحاب کے نام تھے۔ (بخاری)

۷۔۔۔۔۔ فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا تھا، جو ابو شاہ کے لیے لکھا گیا۔ اکتبوا لابی شاہ (بخاری، ابوداؤد)

۸۔۔۔۔۔ کتابُ الصدقہ۔ حضور صلعم نے ابوبکر بن حزم صحابی رضؓ والیٔ بحرین کو لکھائی تھی۔ یہ دو ۲ صفحے تھے اور اس میں زکوٰۃ کے احکامات تھے۔ یہ دوسرے اُمراء کو بھی بھیجا گیا تھا۔ (دار قطنی، مُسند احمد بن حنبل) یہ تحریر خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ نے ابی حزم سے لے لی تھی۔ (دار قطنی)

۹۔۔۔۔۔ محصّلینِ زکوٰۃ کے پاس "کتابُ الصدقہ" کے علاوہ اور بھی تحریریں تھیں۔ (دار قطنی)

۱۰۔۔۔۔۔ عمرو بنِ حزم کو جب یمن کا حاکم مقرر کیا تو ایک تحریر لکھا دی۔ جس میں فرائض، صدقات، دیات، طلاق، اعتاق، صلوٰۃ، مسِّ مصحف وغیرہ کے احکام تھے۔ (کنزل العمال، مسند احمد بنِ حنبل، مستدرک)

۱۱۔۔۔۔۔ عبد اللہ حکیم رضؓ صحابی کے پاس حضور کا ایک مغفرت نامہ تھا جس میں مُردہ جانوروں کے احکام تھے۔ (معجم صغیر، طبرانی)

۱۲۔۔۔۔۔ وائل بن حُجرؓ صحابی کو حضور صلعم نے نماز، روزہ، ربٰو، اور شراب وغیرہ کے احکام لکھا دیئے تھے۔ (معجم صغیر)

۱۳۔۔۔۔۔ ضحاک بنِ سفیانؓ صحابی کے پاس آنحضرت صلعم کی تحریر کرائی ہوئی ایک ہدایت جس میں شوہر کی دیت کا حکم (دار قطنی) اشیم نام تھا اس مقتول کا جس کی بیوی کو شوہر کی دِیت دلانے کا فرمان تحریر کرایا تھا۔ (ابوداؤد)

۱۴۔۔۔۔۔ حضرت معاذ بن جبل کو ایک تحریر یمن میں بھیجی گئی، جس میں سبزیوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہ ہونے کا حکم تھا۔ (دارقطنی)

۱۵۔۔۔۔۔ مدینہ میں بھی مثل مکہ کے حرم ہے اس کے متعلق حضورؐ کی تحریر رافع بن خدیجؓ کے پاس تھی۔ (مسند احمد)

۱۶۔۔۔۔۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک مجموعہ لکھا تھا، جو اُن کے بیٹے کے پاس تھا۔ (جامع)

۱۷۔۔۔۔۔ حضرت ابوہریرہؓ کے پاس دفترِ حدیث لکھا ہوا تھا (فتح الباری) اس مجموعہ میں ۷۴ ۲ سے زیادہ حدیثیں لکھی ہوئی تھیں۔ (تدوینِ حدیث)

۱۸۔۔۔۔۔ حضرت سعد بن عبادہؓ نے ایک مجموعہ مرتب کیا۔ وہ کئی پُشت تک ان کے خاندان میں محفوظ رہا۔ اس مجموعہ کا نام "کتاب سعد بن عبادہؓ" تھا۔ (مسند احمد)

۱۹۔۔۔۔۔ سعد بن ربیع انصاریؓ نے بھی حدیثیں جمع کی تھیں۔ (اسد الغابہ)

۲۰۔۔۔۔۔ سمرہ بن جندب نے بھی ایک نسخۂ حدیث مرتب کیا تھا۔ (تہذیب التہذیب)

صحیح بخاری جلد اوّل صفحہ ۲۲ میں حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ صحابہؓ میں عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ کے علاوہ کسی اور کے پاس مجھ سے زیادہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں ہیں۔ حضرت عبداللہ کے پاس اتنی زیادہ حدیثیں اس وجہ سے ہیں کہ وہ لکھا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا۔ اس پر یہ اشکال کہ مرویاتِ ابوہریرہؓ کی تعداد، مرویاتِ عبداللہ بنِ عمرو بن العاص سے زیادہ ہے اور مذکورہ روایت یہ چاہتی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو کی مرویات زیادہ ہونی چاہئیں فتح الباری میں حافظ ابنِ حجر نے اس کے متعدد محققانہ جواب دیئے ہیں۔ ایک جواب یہ دیا ہے

کہ حضرت عبداللہ بن عمرو عبادت میں زیادہ مشغول رہتے تھے۔ تعلیم اور بیانِ حدیث کی نوبت کم آتی تھی۔ نیز مصر اور طائف میں زیادہ قیام رہا، جو طالبانِ حدیث کا مرجع نہ تھا۔

مُسندِ احمد اور طحاوی جلد دوم صفحہ ۳۸۴ پر اور مجمع الزوائد جلد اوّل صفحہ ۱۵۱ پر حضرت ابوہریرہ رض کا بیان ہے کہ عبداللہ ابنِ عمرو رض اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اور دل سے یاد بھی کرتے تھے اور میں صرف دل سے یاد کرتا تھا لکھتا نہ تھا۔ انہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھنے کی اجازت لی تھی اور آنحضرت صلعم نے ان کو اجازت دے دی تھی۔

مجمع الزوائد جلد اوّل صفحہ ۱۵۱ میں حضرت عبداللہ ابنِ عمرو رض سے مذکور ہے کہ حضور صلعم نے فرمایا: "علم کو مقیّد کرو"۔ حضرت عبداللہ نے پوچھا کہ علم کا مقید کرنا کیا ہے؟ تو ارشاد ہوا: "لکھنا"۔

سننِ ابو داؤد جلد دوم صفحہ ۷۷ اور دارمی صفحہ ۶۸ پر خود حضرت عبداللہ ابنِ عمرو رض کا بیان ہے کہ میں جتنی باتیں آں حضرت صلعم کی زبانِ مبارک سے سُنتا تھا یاد رکھنے کے لیے ان کو قلم بند کر لیتا تھا۔ قریش نے مجھ کو اس سے منع کیا کہ آنحضرت صلعم بشر ہیں اور بہت سی باتیں غصہ کی حالت میں بھی فرما جاتے ہوں گے۔ اس لیے حدیثیں نہ لکھو۔ میں ان کے کہنے سے رُک گیا اور آنحضرت صلعم سے اِس کا ذکر کیا، تو آپؐ نے فرمایا کہ تم لکھو، اور اپنے دہن مبارک کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے فرمایا۔ اِس سے کسی حالت میں ناحق اور غلط بات نہیں نکلتی۔ ان بیانات کا حاصل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابنِ عمرو بن العاص رض آں حضرت صلعم کی زندگی ہی میں آپؐ کی تمام

حدیثیں آپؐ کے حکم واجازت سے لکھتے جاتے تھے۔ فقرہ کنت اکتب کل شئ یعنی "میں ہر بات جو آں حضرت صلعم سے سنتا تھا لکھ لیتا تھا" خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام حدیثیں لکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ رضہ نے کتابتِ حدیث کا جو سلسلہ شروع کیا تھا' اس کو انہوں نے برابر جاری رکھا' تاآنکہ ان کے پاس احادیث کا ایک دفتر تیار ہو گیا۔ اور انہوں نے اس کا نام "صادقہ" رکھا۔ اس دفترِ احادیث سے ان کو ایسا عشق تھا کہ کسی حالت میں بھی اُس کی مفارقت ان کو گوارا نہ تھی۔ فرماتے تھے مایرغبنی فی الحیٰوۃ الا الصادقۃ یعنی "مجھ کو زندگی کا خواہش مند یہی کتاب "صادقہ" بنا رہی ہے۔ یہ نہ ہو تو مجھے جینے کی خواہش نہیں ہے"۔ پھر خود ہی صادقہ کا تعارف اِن الفاظ میں کراتے ہیں'

فاما الصادقۃ فصحیفہ کتبتھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یعنی "صادقہ ایک دفتر ہے۔ جس کو میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن سُن کر لکھا ہے"۔ (دارمی صفحہ ۶۸)

یہ دفترِ احادیث کتنا ضخیم ہو گا اور اس میں کتنی زیادہ حدیثیں ہوں گی؟ اس کا اندازہ لگانے کے لیے حضرت عمرو رضہ کا یہ بیان کافی ہے کہ میں نے آنحضرت صلعم کی زبان سے ایک ہزار صرف امثال یاد کیے ہیں۔ (عینی جلد اول صفحہ ۱۸)

تہذیب التہذیب کے صفحہ ۴۹ پر ابنِ معین کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ ابنِ عمرو رضہ کی چند کتابیں ان کے پوتے شعیبؒ کو ملی تھیں۔ شعیبؒ ان کتابوں سے حدیثوں کی روایت کیا کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ حدیث کی کتابوں میں عمرو بن شعیبؒ عن ابیہ عن جدہٖ کے سلسلہ سے جتنی حدیثیں مذکور ہیں' وہ سب حضرت

عبداللہ ابنِ عمرو رضؓ کے اسی صحیفہ کی ہیں۔ جیسا کہ تہذیب التہذیب (ترجمہ عمرو) میں متعدد محدثین نے اس کی تصریح کی ہے۔ حضرت عبداللہ ابنِ عمرو رضؓ کا یہ صحیفہ شعیبؒ کے بعد ان کے صاحبزادے عمرو رحؒ کے پاس رہا اور وہ اس کو اپنے باپ کے واسطے سے روایت کرتے ہیں۔

عہدِ نبویؐ میں متعدد صحابہؓ کا حدیث لکھنا

یہ خیال بھی نہ کرنا چاہیئے کہ عہدِ نبوی صلعم میں تنہا حضرت عبداللہ ابنِ عمرو رضؓ حدیثیں لکھتے تھے، اس لیے کہ سننِ دارمی کے صفحہ ۶۸ پر خود ان ہی کا بیان ہے کہ ایک دن ہم آنحضرت صلعم کے گرد بیٹھے ہوئے حدیثیں لکھ رہے تھے، اسی اثنا میں کسی نے پوچھا کہ قسطنطنیہ پہلے فتح ہوگا یا رومہ؟ تو آں حضرت صلعم نے فرمایا کہ نہیں، ہرقل کا شہر پہلے فتح ہوگا۔ اس روایت میں بینما نحن حول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نکتب کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ ان کے ساتھ ایک جماعت لکھ رہی تھی حضرت عبداللہؓ ہی کے ایک دوسرے بیان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب انہوں نے احادیث کو لکھنا شروع نہیں کیا تھا اس وقت بھی کوئی صحابی رضؓ لکھا کرتے تھے۔ ان کا وہ بیان مجمع الزوائد جلد دوم صفحہ ۱۵۲ پر اس طرح منقول ہے، کہ آں حضرت صلعم کی خدمت میں چند صحابی بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی ان کیساتھ حاضر تھا۔ آنحضرت صلعم نے اس وقت ارشاد فرمایا کہ "جو آدمی مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔" جب ہم وہاں سے اُٹھے تو میں نے ان صحابیوں سے کہا کہ یہ وعید سننے کے بعد آپ لوگوں کو آں حضرت صلعم کی حدیث بیان کرنے

کی ہمت کیسے ہوئی؟ تو ان صحابۂ کرام رضؓ نے فرمایا "بھتیجے! ہم نے آں حضرت صلعم سے جو کچھ سنا ہے، وہ سب ہمارے پاس لکھا ہوا ہے۔

اسی طرح دوسرے مستند بیانات سے بھی متعدد صحابہ رضؓ کا حدیثیں لکھتے رہنا ثابت ہے۔ چنانچہ مجمع الزوائد جلد اوّل صفحہ ۱۵۱ میں بحوالہ طبرانی حضرت رافع ابنِ خدیج رضؓ کا بیان مذکور ہے کہ ہم نے خدمتِ نبویؐ میں یہ گزارش کی کہ

یارسول اللہ انا نسمع منک اشیاء فنکتبھا قال اکتبوا ولا حرج۔

یعنی "اے اللہ کے رسولؐ! ہم آپؐ سے بہت سی حدیثیں سنتے ہیں اور انکو لکھ لیتے ہیں، تو ان کی نسبت کیا حکم ہے؟ آں حضرت صلعم نے فرمایا، لکھتے رہو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

حضرت رافعؓ کے اس بیان سے بھی معلوم ہوا کہ متعدد اشخاص کا دستور تھا کہ وہ حدیثیں سنکر لکھ لیتے تھے۔ ترمذی جلد دوم صفحہ ۹۱ میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کا بیان ہے کہ ایک انصاری صحابی رضؓ نے حضورؐ سے شکایت کی کہ مجھ کو حدیثیں یاد نہیں رہتیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ "اپنے ہاتھ سے مدد لو" یعنی لکھ لیا کرو۔

مجمع الزوائد جلد اوّل صفحہ ۱۵۲ میں حضرت انس رضؓ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے آں حضرت صلعم کی خدمت میں حدیثوں کے یاد نہ رہنے کی شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا کہ "اپنے ہاتھ سے مدد لو۔" نیز کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۲۲۶ پر حضرت ابنِ عباس رضؓ و حضرت جابر رضؓ سے بھی منقول ہے کہ "آنحضرتؐ نے ہاتھ سے کام لینے کا حکم دیا۔"

عہدِ نبوی کی کتاب الصّدقہ

ابو داؤد جلد اوّل صفحہ ۱۵۶، اور ترمذی جلد اوّل صفحہ ۹۷ میں

حضرت عبداللہ ابنِ عمر رضؓ کا بیان ہے کہ آں حضرت صلعم نے اپنی زندگی کے آخری ایامّ میں اپنے عاملوں کے پاس بھیجنے کے لیے ایک کتابُ الصدقہ" لکھوائی تھی، جس میں جانوروں کی زکوٰۃ سے متعلق حدیثیں تھیں، لیکن ابھی اس کو عاملوں کے پاس بھیجنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ آنحضرت صلعم کی وفات کا سانحہ پیش آگیا، پھر حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ نے اس پر عمل کیا۔

عہدِ نبویؐ کا ایک اور نوشتہ

ترمذیؔ جلد اوّل صفحہ ۳۰۶ پر اور نسائی کی جلد دوم صفحہ ۱۹۱ پر عبداللہ ابنِ حکیم کا بیان ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپؐ کا ایک نوشتہ مبارک ہمارے (قبیلۂ جہینہ کے) پاس پہنچا جس میں یہ حدیث بھی تھی کہ مُردار جانور کی بے پکائی ہوئی کھال اور پٹھے کو کام میں نہ لاؤ!

فتح مکہ کا خُطبہ

صحیح بخاری وغیرہ میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کا بیان ہے کہ آں حضرت صلعم نے فتح مکّہ کے دن ایک طویل خطبہ دیا، جس میں بہت سی حدیثیں ارشاد فرمائیں۔ جب خطبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت ابوشاہ یمنیؓ نے درخواست کی کہ میرے لیے یہ خطبہ لکھوا دیا جائے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی اور حکم دیا کہ ان کو خطبہ لکھ کر دے دیا جائے۔

کتاب عمرو بن حزم رضؓ

طحاوی جلد دوم صفحہ ۴۱۷ اور دوسری کتب حدیث میں ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوشتہ لکھوا کر عمرو بنِ حزم رضؓ کے ہاتھ اہلِ یمن کے پاس

بھیجا تھا۔ اس نوشتہ میں فرائض و سنن اور خوں بہا کے مسائل تھے۔ اس نوشتہ کے جستہ جستہ فقرے حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں۔

حاکمؔ نے اپنی مستدرک جلد اوّل کے صفحہ ۳۹۵ تا ۳۹۷ میں متذکرہ بالا "نوشتہ عمرو بن حزم رض" سے تریسٹھ[٦٣] احادیث نقل کی ہیں۔

نوشتۂ اہلِ یمن

اہلِ یمن کے نام ایک نوشتۂ نبوی ؐ کا ذکر امام شعبیؔ رحؒ نے بھی کیا ہے اور اس نوشتہ کی کئی حدیثیں امام شعبیؔ رحؒ کی روایت سے مصنف ابن ابی شیبہ صفحہ ۱۰ و ۱۲ زکوٰۃ میں منقول ہیں۔

صحیفۂ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

عہدِ نبوی ؐ کے نوشتوں میں سے ایک حضرت علی رض کا صحیفہ بھی تھا۔ جس میں خود حضرت علی رض کے بیان کے مطابق خون بہا اور اسیروں کی رہائی کے مسائل تھے اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ "کوئی مسلمان کافر (حربی کے) بدلے میں نہ مارا جائے"۔ (بخاری: جلد ۱، صفحہ ۲۱) اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ "مدینہ کی سرزمین عیرؔ سے ثورؔ تک حرم (بہت زیادہ قابلِ احترام) ہے۔ لہٰذا جو شخص اِس میں بدعت نکالے یا کسی بدعتی کو پناہ دے، اس پر تمام انسانوں اور فرشتوں کی لعنت ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی کوئی فرض یا نفل عبادت قبول نہ کرے گا۔" (بخاریؔ: جلد ۱، صفحہ ۲۵۱)

اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ "جو شخص غیرِ خدا کی تعظیم و خوشنودی کیلئے جانور ذبح کرے، اس پر اللہ کی لعنت، اور اس پر بھی اللہ کی لعنت جو اپنے باپ پر لعنت کرے، اور اس پر بھی اللہ کی لعنت جو کسی بدعتی کو پناہ دے اور اس پر بھی اللہ کی لعنت جو زمین کا نشان مٹا دے۔" (مسلم جلد ۲، صفحہ ۱۶۱)

اور اس میں یہ حدیث بھی تھی کہ "سب مسلمانوں کا خون برابر ہے اور یہ کہ ایک معمولی مسلمان نے ذمّہ لے لیا تو اس کا پاس ولحاظ سب مسلمانوں پر ضروری ہے اگر کوئی شخص کسی مسلمان کا ذمّہ توڑے گا، تو اس پر خدا اور سارے فرشتوں اور انسانوں کی لعنت۔ اور یہ بھی تھا کہ جو شخص اپنے مولیٰ کے سوا دوسرے کو مولیٰ بنلائے، اس پر بھی سب کی لعنت۔" (بخاری: جلد ۱ صفحہ ۲۵۱)

اور اس میں زکوٰۃ کے مسائل بھی تھے۔" (بخاری: جلد ۱ صفحہ ۴۲۸۔ نیز مُسنَدِ احمد و طحاوی: جلد ۲ صـ ۳۰۴)

عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کتابتِ حدیث کے یہ چند واقعات سرسری طور پر میں نے آپ کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ تلاش و جستجو کرنیوالے کو اور کثیر واقعات مِل سکتے ہیں۔

عہدِ صحابہؓ میں حدیث کی کتابت

اس کے بعد عہدِ صحابہ رضؓ کی تاریخ پڑھئے۔ اس عہد میں بھی آپ کو کتابتِ حدیث کے بے شمار واقعات ملیں گے۔ تمثیل کے طور پر چند واقعات اس عہد کے بھی نقل کیے جاتے ہیں۔

۱ـــــ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت صدّیق اکبر رضؓ کا واقعہ سُنیئے۔ مورّخِ اسلام حافظ ذہبی رح نے تذکرۃ الحفاظ صفحہ ۵ اور شیخ علی متّقی نے کنز العمّال جلد ۵ صفحہ ۲۳۷ میں امام حاکم کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ، حضرت ابو بکر صدّیق رضؓ نے آنحضرت صلعم کی حدیثیں جمع کرنا شروع کی تھیں۔ پانچ سو حدیثیں لکھ چکے تھے کہ ایک دن اس مجموعہ کو منگا کر آگ میں ڈال دیا اور فرمایا۔ اس میں میں نے وہ حدیثیں بھی لکھی تھیں، جن کو

براہِ راست حضور صلعم سے مَیں نے نہیں سُنا تھا۔ بلکہ کسی اور کی زبانی سُنا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے مجھ سے جس طرح بیان کیا ہے اس طرح حضور صلعم نے نہ فرمایا ہو تو خواہ مخواہ میری گردن پر اس کا بوجھ ہوگا۔

۲ دارمی صفحہ ۶۸ و مستدرک حاکم جلد ۱ صفحہ ۱۰۶ میں امیرالمومنین فاروقِ اعظم رضہ کا یہ فرمان منقول ہے کہ علم کو کتاب میں مقیّد کر لو۔

۳ دارمی و مستدرک میں حضرت انسؓ رضہ سے بھی مروی ہے کہ علم کو لکھ کر مقیّد کرد۔ نیز صحیح مسلم جلد اوّل صفحہ ۴۶ میں ہے کہ حضرت انسؓ رضہ نے محمود ابن الربیعؓ صحابی کی زبانی حضرت عتبانؓ رضہ کی ایک طویل حدیث سُنی تو اپنے لڑکے سے کہا' اس کو لکھ لو۔ چنانچہ انہوں نے لکھ لیا۔ طحاویؔ جلد دوم صفحہ ۲۸۴ میں بھی حضرت انسؓ رضہ کا اپنے لڑکے سے حدیث لکھوانا مذکور ہے۔

۴ حضرت ابوہریرہ رضہ کی نسبت اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ عہدِ نبوی صلعم میں حدیثوں کو لکھا نہ کرتے تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے بھی اپنے ہاتھ سے لکھ کر یا کسی دوسرے سے لکھوا کر اپنی حدیثوں کو سفینہ میں محفوظ کر لیا تھا۔ چنانچہ فتح الباری جلد ۱ صفحہ ۱۸۴ میں حسن ابنِ عمرو رضہ کا بیان ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور حدیث نبوی صلعم کی کئی کتابیں دکھا کر فرمایا کہ دیکھو یہ میرے پاس لکھی ہوئی موجود ہیں۔ اور بشیر ابنِ نہیکؒ کا بیان طحاوی جلد ۲ صفحہ ۳۸۵ میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضہ سے حدیث کی کتابیں عاریتاً لے کر نقل کرتا تھا۔ نقل سے فارغ ہو کر اُن کو کُل سُنا دیتا تھا اور سُنانے کے بعد عرض کرتا تھا کہ مَیں نے آپ کو جو سُنایا ہے وہ سب آپ نے رسول اللہ صلعم سے سُنا ہے ؟ وہ فرماتے تھے کہ ہاں !

۵ ــــــ حضرت ابنِ عبّاس رض کے بھی چند صحیفے تھے، جن میں حدیثیں قلم بند تھیں۔ چنانچہ ترمذیؔ جلد ۲ صفحہ ۲۳۸ اور طحاویؔ جلد ۲ صفحہ ۳۸۴ میں ہے کہ طائف کے کچھ لوگ حضرت ابنِ عبّاس رض کے پاس ان کے چند صحیفے لے کر حاضر ہوئے کہ آپ ہم کو یہ سُنا دیں۔ اس وقت حضرت ابنِ عباس رض کی نگاہ بہت کمزور ہو چکی تھی، اس لیے وہ پڑھ نہ سکے اور فرمایا، تم خود سُنا دو۔ تمہارا سُنانا اور میرا پڑھنا جوازِ روایت کے حق میں دونوں برابر ہیں۔

۶ ــــــ ابوداؤدؔ جلد ۲ صفحہ ۱۸۱، ابوالبختریؒ کا بیان ہے کہ میں نے ایک صحابی رض یا تابعی رض سے حدیث سُنی اور مجھ کو بہت بھلی معلوم ہوئی تو میں نے ان سے درخواست کی کہ اس کو میرے لیے لکھ دیجیے۔ چنانچہ انہوں نے لکھ کر میرے حوالہ کی

۷ ــــــ دارمیؔ بر صفحہ ۶۸ مذکور ہے کہ ابانؒ (تابعی) حضرت انسؔ رض کے پاس بیٹھے ساگون کی تختیوں پر حدیثیں لکھتے رہتے تھے۔

۸ ــــــ طحاویؔ جلد ۲ صفحہ ۳۸۴ میں عبداللہ ابنِ محمد ابنِ عقیل کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت جابر رض کی خدمت میں حاضر ہو کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو پوچھتے تھے اور لکھ لیتے تھے۔

۹ ــــــ دارمیؔ صفحہ ۶۹ میں ہے کہ، حضرت ابنِ عمر رض نے فرمایا کہ علم کو قیدِ تحریر میں لاؤ۔ چنانچہ دارمیؔ ہی میں حضرت سعید ابنِ جبیر کا بیان ہے کہ میں حضرت ابنِ عمر رض سے حدیثیں سُنتا تھا تو لکھ لیتا تھا۔

۱۰ ــــــ دارمیؔ، صفحہ ۱۶۹ اور طحاویؔ جلد ۲ صفحہ ۳۸۴ میں ہے کہ حضرت سعید ابنِ جبیرؒ وغیرہ حضرت ابنِ عباس رض کے پاس حدیثیں لکھتے رہتے تھے بلکہ دارمیؔ میں یہ بھی ہے

کہ کاغذ بھر جاتا تھا تو کسی دوسری چیز پر لکھ لیتے تھے۔

۱۱ــــــ دارمی صفحہ ۶۹ میں ہے کہ عنترہ رضؓ کو بھی حضرت ابنِ عباس رضؓ نے لکھنے کی اجازت دی۔

۱۲ــــــ دارمی، صفحہ ۶۹ میں حضرت عبداللہ ابن خلنش رضؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت براء رضؓ کی مجلس میں لوگوں کو ہتھیلیوں پر بھی حدیث لکھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ناچیز کہتا ہے کہ کاغذ بھر جاتا ہوگا تو ہتھیلیوں پر اس لیے لکھ لیتے ہونگے کہ گھر پہنچ کر کاغذ پر نقل کرلیں گے۔

۱۳ــــــ دارمی میں ہے کہ حسن ابنِ جابر رحؒ نے حضرت ابوامامہ باہلیؓ سے حدیث لکھنے کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

۱۴ــــــ مجمع الزوائد جلد اوّل صفحہ ۱۵۱ میں ابوبردہ اشعریؒ کا بیان مذکور ہے کہ میں اپنے والد حضرت ابوموسیٰ اشعری رضؓ سے حدیثیں سنتا تھا تو لکھ دیا کرتا تھا۔ ایک دن میرے والد نے میرا مجموعہ منگا کر مجھ سے پڑھوایا۔ جب میں پڑھنے سے فارغ ہوا تو فرمایا، ہاں میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح سنا ہے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کچھ کمی بیشی نہ ہوجائے۔

عہدِ تابعین میں کتابتِ حدیث

اوپر جو واقعات آپ نے پڑھے ہیں ان میں صحابۂ کرام رضؓ کے سامنے یا صحابہ رضؓ سے سنکر حدیث لکھنے کا ذکر ہے۔ اب چند ایسے واقعات سنئے جن میں تابعین کے سامنے یا تابعین سے سنکر حدیث لکھنے کا تذکرہ ہے:

۱ــــــ ترمذی جلد دوم صفحہ ۲۲۸ اور دارمی صفحہ ۶۶ میں ابراہیم نخعیؒ کا بیان ہے کہ سالم ابن ابی الجعد حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ سالمؒ کی وفات ۱۰۱ھ میں ہوئی ہے اور انہوں نے بعض صحابہ سے بھی حدیثیں سُنی ہیں۔

۲ــــــ تذکرۃ الحفاظ جلد اوّل صفحہ ۱۰۲ میں ابوالزناد (تابعی) کا بیان ہے کہ ہم زُہری کے ساتھ علماء کے پاس حدیثیں سُننے کے لیے جاتے تھے۔ زُہری اپنے ساتھ تختیاں اور کاغذ لیے رہتے تھے اور جس قدر سُنتے سب لکھتے رہتے تھے۔ زہری کی وفات ۱۲۴ ہجری میں ہوئی ہے۔

۳ــــــ کنز العمال جلد ۵ صفحہ ۲۲۸ میں صالح بن کیسانؒ کا بیان ہے کہ طالبعلمی کے زمانہ میں میرا اور زہری کا ساتھ تھا۔ زہریؒ نے مجھ سے کہا کہ آؤ آنحضرت صلعم کی حدیثیں لکھیں، چنانچہ ہم دونوں نے حدیثیں لکھیں۔

۴ــــــ دارمی صفحہ ۶۹ میں رجاء ابنِ حیوۃؒ (المتوفی ۱۱۲ھ) کا بیان ہے کہ ہشام ابنِ عبدالملکؒ نے اپنے عامل کو مجھ سے ایک حدیث دریافت کرنے کے لیے لکھا۔ اگر وہ حدیث میرے پاس لکھی ہوئی نہ ہوتی، تو میں اس کو بھول ہی چکا تھا۔

۵ــــــ دارمی، صفحہ ۶۹ میں ہشام ابن الغازؒ کا بیان منقول ہے کہ عطاء ابنِ ابی رباح تابعیؒ سے لوگ پوچھتے جاتے تھے اور ان ہی کے سامنے لکھتے جاتے تھے۔ (عطاءؒ کی وفات ۱۱۴ ہجری میں ہوئی)

۶ــــــ دارمی میں سلیمان ابنِ موسیٰؒ کا بیان ہے کہ میں نے نافعؒ کو دیکھا ہے کہ وہ حدیثیں اپنی زبان سے بولتے جاتے تھے اور لوگ ان کے سامنے لکھتے جاتے

تھے۔ (نافعؒ کا انتقال ۱۱۷ ہجری میں ہوا)

۷ ـــــــ ترمذی جلد ۲ صفحہ ۲۳۹ میں ہے کہ ایک شخص حسن بصری رح کے پاس آیا اور کہا کہ میرے پاس آپ کی بیان کردہ کچھ حدیثیں لکھی ہوئی ہیں، میں اُن کی روایت آپ سے کرسکتا ہوں؟ تو انہوں نے کہا: "ہاں"! تہذیب التہذیب میں ہے کہ حمید طویلؒ نے حسن بصری رح کی کتابیں نقل کی تھیں۔ (جلد ۳ صفحہ ۳۹) حسن بصریؒ کی وفات ۱۱۰ ہجری میں ہوئی۔

۸ ـــــــ ترمذی جلد ۲ صفحہ ۲۳۹ میں ابنِ جریجؒ کا بیان ہے کہ میں ہشام بنِ عروہؒ کے پاس ایک کتاب لے کر پہنچا اور کہا کہ یہ آپ کی روایتیں ہیں۔ ان کو میں بیان کردوں؟ تو انہوں نے کہا "ہاں"۔ ہشام بنِ عروہؒ کی وفات ۱۴۶ ہجری میں ہوئی۔

۹ ـــــــ تذکرۃ الحفاظ جلد اوّل صفحہ ۸۸ میں ہے کہ ابو قلابہؒ وفات کے وقت اپنی کتابوں کی وصیت ایوبؒ سختیانی کے لیے کر گئے تھے، چنانچہ وہ کتابیں شام سے اونٹ پر بار کر کے لائی گئیں۔ ایوبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے بارہ، چودہ درم ان کا کرایہ ادا کیا۔ ابو قلابہ کی وفات ۱۰۴ ہجری میں ہوئی۔

۱۰ ـــــــ صحیح بخاری جلد اوّل صفحہ ۲۰، اسعاف المبطا صفحہ ۵، دارمی صفحہ ۶۸ میں ہے کہ خلیفۂ راشد حضرت عمر بنِ عبدالعزیزؒ نے تمام اطرافِ سلطنت میں یہ فرمان بھیجا، کہ آں حضرت صلعم کی حدیثوں کو جمع کرو۔ چنانچہ ابوبکر بنِ حزمؒ (جو اُن کی طرف سے مدینہ کے امیر و قاضی تھے) کے پاس جب یہ فرمان پہنچا تو انہوں نے حدیث کے کئی مجموعے تیار کیے۔ مگر ابھی ان کو دربارِ خلافت میں بھیجنے کی نوبت نہیں آئی تھی

کہ عمر بن عبدالعزیز رح کی وفات ہوگئی۔ نیز عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم سے ابن شہاب زہریؒ نے بھی حدیثوں کو مدوّن کیا تھا۔ تذکرۃ الحفاظ جلد اوّل صفحہ ۱۰۶ میں معمرؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ زہریؒ کی حدیثوں کے دفتر کئی اونٹوں پر بار کیے گئے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی وفات ۱۰۱ ہجری میں ہوئی ہے۔

لہٰذا تابعین کے یہ چند واقعات برسبیل تذکرہ میں نے پیش کیے ہیں اور ہر واقعہ کے ساتھ صاحب واقعہ کا سنِ وفات بھی لکھ دیا ہے۔ سن ہائے وفات کو دیکھ کر آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ واقعات وفاتِ نبویؐ سے صرف سو برس بعد کے ہیں بلکہ اکثر تو سو برس کے اندر ہی کے ہیں۔

تبع تابعینؒ کے عہد میں حدیث کی کتابت

اب ذرا اور قریب آیئے اور تبع تابعین کا دور نظر کے سامنے رکھیئے تو اور زیادہ کتابتِ حدیث کے واقعات آپ کی نگاہ سے گزریں گے اور حدیثوں کے دفتر کے دفتر آپ کو دکھائی دیں گے، جو اس عہد میں لکھے گئے اور ان میں سے بعض آج بھی ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔ اس دور میں حدیثوں کے لکھنے کا یہ دستور تو باقی ہی تھا کہ اُستاد سے جو حدیثیں سُنیں لکھ لیں، چنانچہ محمد ابن بشر کا بیان ہے کہ مسعر المتوفیٰ ۱۵۵ ہجری کے پاس ایک ہزار حدیثیں تھیں۔ میں نے دس کے علاوہ تمام حدیثیں لکھ لیں۔

تذکرہ صفحہ ۱۷۷ میں عبدالرزاق کا بیان ہے کہ میں نے معمرؒ المتوفیٰ ۱۵۲ھ سے دس ہزار حدیثیں سُن کر لکھی ہیں۔

تذکرہ جلد اوّل صفحہ ۱۷۵ میں ہے کہ حمّاد بن سلمہؒ کے پاس قیس بن سعدؒ کی کتاب تھی۔

تذکرہ جلد اوّل صفحہ ۱۹۸ پر مذکور ہے کہ جب سفیان ثوریؒ یمن گئے تو اُن کو ایک تیز لکھنے والے کاتب کی ضرورت ہوئی۔ ہشام ابن یوسفؒ کا بیان ہے کہ لوگوں نے مجھ کو پیش کیا۔ چنانچہ میں اُن کیلئے حدیثیں لکھا کرتا تھا۔

تذکرہ جلد اوّل صفحہ ۲۱۶ پر ابو نعیمؒ کا بیان ہے کہ میں نے آٹھ سو مشائخ سے حدیثیں لکھی ہیں۔ شعیب بن حمزہؒ نے بہت زیادہ حدیثیں لکھی تھیں۔ زہری بولتے اور شعیبؒ لکھتے تھے۔ امام احمدؒ نے شعیبؒ کی کتابیں دیکھی تھیں۔ ان کا بیان ہے کہ شعیبؒ کی کتابیں بہت صحیح اور درست تھیں۔ شعیبؒ کی وفات ۱۶۳ ہجری میں ہوئی ہے۔ (تذکرہ : جلد ۱ صفحہ ۲۱۰)

ابو عوانہؒ پڑھنا جانتے تھے، لکھنا نہیں جانتے تھے، اس لیے جب حدیث سُننے کے لیے جاتے تو دوسرے سے لکھواتے تھے۔ ابو عوانہؒ کی وفات ۱۷۶ ہجری میں ہوئی۔ (تذکرہ : جلد ۱، صفحہ ۲۱۹)

ابن لہیعہؒ کے پاس بھی حدیث کی کتابیں تھیں، چنانچہ ابن صالحؒ کا بیان ہے کہ میں نے عمارہ ابن غزیہؒ کی حدیثیں ابن لہیعہؒ ہی کی اصل سے نقل کی ہیں۔ ابن لہیعہؒ نے ۱۷۴ ہجری میں انتقال کیا۔ (تذکرہ : جلد ۱، صفحہ ۲۲۰)

عہدِ صحابہؓ میں مدارسِ حدیث

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرتِ عائشہ رضؓ حدیث کا درس دیا

کرتی تھیں۔ لڑکے، عورتیں، بچے اور وہ مرد جن سے پردہ نہ تھا، ان کے حجرے میں آجاتے تھے، باقی مسجدِ نبویؐ میں بیٹھتے تھے سامنے پردہ پڑا رہتا تھا۔ حضرتِ عائشہ رضؓ مسائل و حدیث بیان فرماتیں۔ شاگردوں کی زبان، طرزِ ادا، صحتِ تلفظ کی سختی سے نگرانی کرتیں۔ ایک مرتبہ قاسمؒ اور ابنِ ابی عتیق دونوں بچے پہنچے۔ قاسم کی زبان صاف نہ تھی، حضرتِ عائشہ رضؓ نے ان کو ٹوکا۔ (مسلم) حضرتِ عائشہ رضؓ اکثر بچوں کو حدیث سکھانے کے لیے اپنی تربیت میں لے لیتی تھیں اور ان کے مصارف خود برداشت کرتی تھیں۔ عروہ، قاسم، ابوسلمہ، مسروق، عمرہ اور صفیہ کی تعلیم بڑی شفقتِ مادرانہ سے کی۔ عمرہ انصاریہ حضرتِ عائشہ رضؓ کو خالہ کہتی تھیں (تذکرہ ذہبی) حضرتِ عائشہ رضؓ کے شاگردوں کی تعداد دو سو سے زائد تھی۔ ان میں ۲۸ عورتیں تھیں، جلیل القدر اصحاب مثل ابوموسیٰ اشعری، ابوہریرہ، عبداللہ ابنِ عمر، عبداللہ ابنِ عباس اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم بھی حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ حضرتِ عائشہ رضؓ کے رشتہ داروں میں اُن کے رضاعی بھائی عوف بن حارث، اُن کی بہن اُمِ کلثوم، ان کے بھتیجے قاسم و عبداللہ، ان کی بھتیجیاں حفصہ و اسماء بناتِ عبدالرحمٰن اور ان کے بھائی کے پڑپوتے عبداللہ بن عتیق بن محمد بن عبدالرحمٰن اور ان کے بھانجے قاسم و عبداللہ پسران عبداللہ اور ان کی بھانجی عائشہ بنتِ طلحہ اور ان کے بھانجوں کے پوتے عباد بن حبیب و عباد بن حمزہ تھے۔

حضرتِ عمر رضؓ نے تمام ممالکِ محروسہ میں مدارس قائم کیے۔ ابنِ ابی جبلہ کو مصر میں معلم مقرر کر کے بھیجا۔ (حسن المحاضرہ) فاروقِ اعظم عبداللہ بن مسعودؓ را با جمعے بکوفہ فرستاد و معقل بن یسارؓ و عبداللہ بن مغفلؓ و عمران بن حصینؓ را بہ بصرہ و عبادہ

بن الصامت و ابوالدرداء را بہ شام دبمعاویہ بن ابی سفیان کہ امیر شام بود قدغن بلیغ نوشت کہ از حدیثِ ایشاں تجاوز نہ کند۔" (ازالۃ الخفا شاہ ولی اللہ، وطبقات الحفاظ، واسد الغابہ)

کوفہ میں ابنِ مسعود رضؓ کے درس میں چار ہزار طلباء شریک ہوتے تھے۔(اسرار الانوار) حضرت ابوادریس خولانی نے بیان کیا، میں حمص کی مسجد میں گیا تو ایک حلقہ میں جس میں ۳۲ صحابہ تھے، بیٹھ گیا۔ ایک صاحب روایت کر چکتے تو دوسرے صاحب شروع کرتے۔ (مسندِ احمد بن حنبل جلد ۵)

حضرت نصر بن عاصم لیثی کا بیان ہے کہ میں کوفہ کی مسجد میں گیا تو ایک حلقہ نظر آیا جو نہایت خاموشی کے ساتھ ایک شخص کی طرف کان لگائے ہوئے بیٹھا ہے، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ ہیں۔ (مسند احمد)

حضرت ابوالدرداء رضؓ دمشق میں رہتے تھے، وہ درس دینے کیلئے جب مسجد میں آتے تو ان کے ساتھ طلباء کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا، جیسا کہ بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ (تذکرۃ الحفاظ) ان کے درس میں سولہ سو سے زیادہ طلبہ تھے۔ (طبقات القراء)

حضرت اشقیا صبحی مدینہ آئے تو دیکھا کہ ایک شخص کے گرد بھیڑ لگی ہوئی ہے، پوچھا یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا حضرت ابوہریرہ رضؓ (ترمذی)

حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ کا حلقۂ درسِ حدیث مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہوتا تھا۔ (حسن المحاضرہ)

حضرت امیر معاویہ رضؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن شبلؓ کو لکھا کہ لوگوں کو حدیث

کی تعلیم دو اور جب میرے خیمہ کے پاس کھڑے ہو تو مجھے حدیث سناؤ۔ (مسند احمد)
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علم کے تین مراکز تھے۔ مدینہ، مکہ اور کوفہ۔
مکہ کے صدر مدرس حضرت ابنِ عباس رضؓ، مدینہ کے حضرت ابنِ عمر رضؓ و زید بن ثابت رضؓ اور کوفہ کے حضرت ابنِ مسعود رضؓ تھے۔ (اعلام الموقعین)

علی بن زرعہ رازیؒ کا قول ہے کہ آپؐ کی وفات کے بعد تک جن لوگوں نے آپؐ کو دیکھا اور آپؐ سے حدیث سُنی، ان کی تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تھی۔ ان میں سے ہر ایک نے آپؐ سے روایت کی تھی۔ ابنِ فتحون نے ذیلِ استیعاب میں اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ ابو زرعہ نے یہ تعداد صرف ان لوگوں کی بتائی ہے جو روایتِ حدیث تھے۔ لیکن ان کے علاوہ صحابہ کی جو تعداد ہوگی، وہ اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔ علامہ ابنِ عبدالبر نے استیعاب میں تین ہزار پانچ سو پچاس ایسے اصحاب کے نام لکھے ہیں، جنھوں نے حدیث کی روایت کی ہے۔ اُسدُ الغابہ میں سات ہزار پانچ سو چون اصحاب کا ذکر ہے۔ گیارہ ہزار آدمی ایسے ہیں جن کے نام دلنشان آج تحریری صورت میں تاریخ کے اوراق میں جو خاص ان ہی کے حالات میں لکھے گئے ہیں، اس لیے موجود ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن میں سے ہر ایک نے کم و بیش آنحضرت صلعم کے اقوال و افعال میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دوسروں تک پہنچا دیا ہے۔ یعنی جنھوں نے روایت کی خدمت انجام دی ہے، اور یہی سبب ان کی تاریخی زندگی کا ہے۔

ایک شبہہ کا ازالہ

شبہہ کا منشا صرف آٹھ واقعات ہیں جو ذیل میں درج ہیں:۔

۱۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلعم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا "تم لوگ رسول اللہ صلعم سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو، جن میں تم لوگوں کے درمیان اختلاف ہوتا ہے، اور تمہارے بعد جو لوگ ہوں گے، ان میں اس سے بھی زیادہ اختلاف ہوگا۔ تو رسول اللہ صلعم سے کوئی حدیث نہ روایت کرو۔ جو شخص تم سے سوال کرے، اس سے کہو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان خدا کی کتاب ہے، اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام سمجھو"۔

۲۔ حافظ ذہبی نے بہ سند بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے جب ہم کو عراق کی طرف روانہ فرمایا تو ہمارے ساتھ خود بھی چلے اور فرمایا تم کو معلوم ہے کہ میں کیوں تمہاری مشایعت کرتا ہوں؟ لوگوں نے کہا کہ ہماری عزت افزائی کے لیے۔ بولے اس کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ تم ایسی آبادی کے پاس جا رہے ہو جو شہد کی مکھیوں کی طرح گنگنا کر قرآن مجید پڑھتے ہیں، تو احادیث کی روایت کر کے ان کی تلاوتِ قرآن میں رکاوٹ نہ پیدا کرنا۔ صرف قرآن مجید پر بس کرو اور رسول اللہ صلعم سے روایت کم کرو اور اس میں، میں بھی تمہارا شریک ہوں۔ چنانچہ جب قرظہ آئے تو لوگوں نے روایتِ حدیث کی خواہش کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ، ہم کو حضرت عمر رضؓ نے اس کی ممانعت کی ہے۔

۳۔ ابوسلمہؓ نے بیان کیا کہ میں نے ابوہریرہ رضؓ سے کہا کہ تم حضرت عمر رضؓ کے زمانے میں بھی اسی طرح روایت کرتے تھے؟ فرمایا کہ جس طرح میں تم سے روایت

کرتا ہوں اگر اسی طرح حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں بھی روایت کرتا تو وہ مجھے اپنے کوڑے سے مارتے۔

۴۔ حضرت عمر رضؓ نے تین شخص یعنی ابنِ مسعود رضؓ اور ابو الدرداء رضؓ اور ابو مسعود انصاری رضؓ کو قید کر دیا کہ تم نے رسول اللہ صؐ سے بہت زیادہ روایتیں کر دیں۔

۵۔ حضرت معاویہ رضؓ یہ کہا کرتے تھے کہ 'تم لوگ بھی حدیث کے ساتھ وہی طرزِ عمل اختیار کرو جو حضرت عمر رضؓ کے زمانے میں جاری تھا۔ کیونکہ انہوں نے رسول اللہ صؐ سے روایتِ حدیث کرنے کے متعلق لوگوں کو دھمکیاں دی تھیں۔

۶۔ سیوطی نے تنویر الحوالک میں یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضؓ نے احادیث کو لکھوانا چاہا اور اس بارے میں اصحابِ رسول اللہ صلعم سے مشورہ کیا تو عام صحابہ رضؓ نے اِس کا مشورہ دیا، لیکن وہ خود ایک غیر متیقن طور پر اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے 'ایک دن انہوں نے یقینی رائے قائم کر لی اور فرمایا کہ میں نے 'جیسا تم لوگوں کو معلوم ہے' تم سے تحریرِ احادیث کا ذکر کیا تھا۔ پھر میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ تم سے پہلے اہلِ کتاب میں سے بہت سے لوگوں نے کتابُ اللہ کیساتھ اور کتابیں لکھیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُنہی کتابوں میں مشغول ہو گئے اور کتابُ اللہ کو چھوڑ دیا۔ اِس بِنا پر خدا کی قسم میں کتابُ اللہ کو کسی اور چیز کے ساتھ مخلوط نہ کرونگا۔ اس لیے انہوں نے تحریرِ احادیث کا کام چھوڑ دیا۔ ابنِ سعد نے بھی طبقات میں اسی کے مثل روایت کی ہے۔

۷۔ امام بخاری رحؒ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کی ہے کہ حضرت علی رضؓ نے فرمایا کہ ہمارے پاس بجز کتابُ اللہ کے اور ان احادیث کے جو اس صحیفہ میں

درج ہیں، پڑھنے کی اور کوئی کتاب نہیں۔

۸۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے پانچ سو حدیثوں کا مجموعہ تیار کیا تھا۔ ایک رات بہت بے چین ہوئے۔ حضرت عائشہ رضؓ نے سبب دریافت کیا۔ صبح کو فرمایا کہ وہ احادیث کا مجموعہ لے آؤ۔ وہ لائیں تو آپ نے اُس کو جلا دیا۔ حضرت عائشہؓ نے جلانے کی وجہ دریافت کی، تو فرمایا، مجھے خوف ہے کہ مَیں مر جاؤں اور یہ مجموعہ رہ جائے، ممکن ہے کہ میں نے ایسے لوگوں سے حدیثیں لی ہوں جن کو میں امین سمجھتا ہوں اور مجھے اُن پر وثوق ہے، لیکن وہ واقع میں ایسے نہ ہوں۔ (تذکرۃ الحفاظ)

اِن ائمۂ فتاویٰ اور پیشوایانِ اسلام سے جو روایتیں نقل کی گئیں، اُن پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ احادیث سے زیادہ استدلال نہیں کر سکتے تھے اور احادیث کو احکامِ قرآنیہ کا مکمل نہیں سمجھتے تھے۔ (یہی استدلال منکرینِ حدیث کا ہے) لیکن احادیث سے استدلال کرنے کے متعلق جو روایتیں اُن سے مروی ہیں، اگر ہم اُن پر نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیوں صحابہ رضؓ سے یہ خواہش کرتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلعم سے کم روایات کریں۔ چنانچہ اِس مختصر تحریر میں اس قسم کی چند روایتیں ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

۱۔ ذہبیؔ نے تذکرۃ الحفاظ میں بہ سند روایت کیا ہے۔ اسی طرح یہ اور ذیل کی دیگر احادیث صحاحؔ میں بھی موجود ہیں کہ، ایک دادی حضرت ابوبکر رضؓ کی خدمت میں اپنا حقِ وراثت مانگنے کے لیے آئی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ میں کتابُ اللہ میں تمہارا کوئی حصہؔ نہیں پاتا اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلعم نے تمہارا کوئی حصہؔ مقرر فرمایا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے لوگوں سے دریافت کیا تو مغیرہؓ کھڑے

ہوئے اور کہا کہ میں نے سُنا ہے کہ رسول اللہ صلعم دادی کو چھٹا حصّہ دیتے تھے۔ حضرت ابو بکر رضؓ نے فرمایا کہ تمہارا کوئی مؤیّد ہے؟ تو حضرت محمّد بن مسلمہ رضؓ نے شہادت دی۔ پھر انہوں نے دادی کو حصّہ دلوایا۔

۲۔ ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ نے دروازے کی اوٹ سے حضرت عمر رضؓ کو تین بار سلام کیا، لیکن ان کو اندر داخلہ کی اجازت نہ ملی۔ وہ واپس آئے تو حضرت عمر رضؓ نے ان کے پیچھے آدمی بھیجا اور بُلا کر کہا کہ تم واپس کیوں چلے گئے؟ انہوں نے جواب دیا کہ، میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص تین بار سلام کر چکے اور اس کو اذن نہ ملے تو وہ واپس چلا آئے۔ حضرت عمر رضؓ نے فرمایا، اس پر گواہ لاؤ ورنہ تم کو سزا دوں گا۔ اب حضرت ابو موسیٰ رضؓ ہمارے پاس حالتِ غم میں تشریف لائے اور ہم سب بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ انہوں نے ہم کو اس واقعہ کی خبر دی اور کہا، کیا تم میں سے کسی نے اِس حدیث کو سُنا ہے۔ چنانچہ اس جماعت نے اپنا ایک آدمی ان کے ساتھ کر دیا۔ جس نے آکر حضرت عمر رضؓ کو اس حدیث کی خبر دی۔

۳۔ مغیرہ بن شعبہ رضؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے صحابہ سے عورت کے ساقط کردہ حمل (یعنی جو کسی کے مارنے پیٹنے سے ساقط ہو جائے) کے بارے میں مشورہ کیا، تو میں نے کہا کہ رسول اللہ صؐ نے اِس کی دیت ایک لونڈی یا غلام دلوائی ہے۔ حضرت عمر رضؓ نے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو ایک اور آدمی کو بھی لاؤ جو اِس حدیث کو جانتا ہو۔ تو محمّد بن مسلمہ رضؓ نے اِس کی شہادت دی۔

۴۔ حضرت اُبَیّ رضؓ نے حضرت عمر رضؓ سے چند حدیثیں بیان کیں، تو انہوں نے کہا کہ

اس پر میرے سامنے کوئی گواہی لاؤ۔ وہ اس غرض سے نکلے تو ان کو چند انصاری ملے جن سے انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم نے اس کو رسول اللہ صلعم سے سنا ہے۔ اس پر حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ میں نے تم پر تہمت نہیں لگائی بلکہ میں نے یہ چاہا کہ اس معاملہ میں ثبوت طلب کروں۔

۵۔ اسماء بن الحکمؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضؓ کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ میں جب خود رسول اللہ صلعم سے کوئی حدیث سُنتا تھا تو خدا کو اس کے ذریعہ سے مجھے جس قدر فائدہ پہنچانا ہوتا تھا، پہنچا دیتا تھا۔ لیکن جب آپؐ کے علاوہ مجھ سے کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو میں اس سے قسم لیتا تھا اور جب وہ قسم کھالیتا تو میں اس کی تصدیق کرتا تھا۔

اِن تمام احادیث مذکورہ اور جملہ اس قسم کی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس دَور کے جُملہ ائمۂ مسلمین اور پیشوایانِ اسلام، قرآن کے بعد حدیث ہی کو حجت مانتے تھے اور حدیث کو مکمّل قرآن سمجھتے تھے۔ صرف اِس خوف سے تقلیلِ روایت کا مشورہ دیتے تھے کہ رسول اللہ صلعم کے متعلق کذب و غلط بیانی کا رواج نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے سامنے جو روایتیں بیان کی جاتی تھیں، اُن کا ثبوت طلب کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت عمر رضؓ صرف انہی حدیثوں کو قبول کرتے تھے جن کی نسبت شہادت سے حضورؐ کا ارشاد ہونا ثابت ہو جاتا۔ اِسی بناء پر حضرت ابوبکر رضؓ نے ایک ایسے شخص کو طلب کیا جو مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت کی تائید کرے اور حضرت عمر رضؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت اُبَیؓ کے مؤیّدین کی تلاش کی اور حضرت علی رضؓ راوی سے قسم لیتے تھے۔ حالانکہ رفعت و عظمت کے لحاظ

سے اُن میں باہم کس قدر اعتماد تھا۔ لیکن جب قابلِ اطمینان طریقہ پر روایات کا ثبوت ہوجاتا تھا تو وہ لوگ اُس پر عمل کرنا ضروری سمجھتے تھے اور اپنے معاملات کی انجام دہی کے لیے اصول کا مأخذ قرار دیتے تھے۔

یہ معنیٰ ہرگز نہیں کہ یہ ائمہ احادیثِ رسول ؐ کو تشریعی حیثیت نہ دیتے تھے اور مکملِ قرآن نہ سمجھتے تھے اور احادیثِ رسول صؐ کی روایت اور حفاظت کو غیر ضروری اور ناقابلِ عمل تصور کرتے تھے اور صرف تاریخی حیثیت دیتے تھے۔ اگر مالعقول اور قلتِ روایات اور خشیتِ روایات کی یہ غرض ہوتی تو تنقید اور صحتِ روایات کے بعد کیوں قبول کرتے۔

خود شیخین میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے ۱۴۲ اور حضرت عمر بن الخطاب رضؓ سے ۵۳۹ حدیثیں کیوں منقول ہوتیں۔ اور اس بدعت کو (خاکم بدہن) بنتِ صدیق رضؓ اور آں حضرت صلعم کی رفیقۂ حیات اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضؓ بھی نہ سمجھیں اور انہوں نے بھی ۲۲۱۰ احادیث روایت کر ڈالیں، اور اسی طرح حضرت عمر رضؓ کے صاحبزادے، حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ بھی نہ سمجھے اور ۱۶۳۰، حدیثیں نقل کر ڈالیں۔ نہ اس مُراد کو صحابہ رضؓ سمجھے نہ تابعینؒ نہ تبع تابعین نہ ائمۂ مجتہدین، یہاں تک کہ معتزلین کا وجود ہوا کہ انہوں نے حدیث کا انکار شروع کیا اور قبولِ احادیث کے باب میں لایعنی صورتیں اور حیل وبہانہ سازی کی باتیں اور تاویل طرازیاں شروع کیں۔ کہیں خلافِ عقل، کہیں خبر آحاد کے موانع تراشے گئے۔ بایں ہمہ اس جماعت نے بھی حدیث کا من حیث الحدیث انکار نہ کیا، صرف خاص اقسامِ حدیث کا انکار تھا لیکن اس کو فروغ نہ ہوسکا اور

ان کی بات صدا بصحرا ہو کر رہ گئی۔

پھر منکرینِ حدیث کا زمانہ آیا، یہاں تک کہ ہمارا چودھویں صدی کا دَور دورۂ الحاد اور بیدینی کا آغاز ہوا اور اصلی دین اور حقیقی اسلام وہ احکامِ قرآن بنے، جس کو ہر حاکمِ وقت قرآن کی مُراد ہونا بتلا دے۔ خواہ وہ حاکمِ وقت دین کا عالم ہو یا جاہل، عاقل ہو یا احمق، شرابی ہو یا زانی، صرف زمامِ حکومت ہاتھ میں ہو تب تبیین مُرادِ خداوندی اور توضیح و تفسیرِ قرآن کا حق مِل سکتا ہے اور نبی و مزکیِّ خلائق کی حیثیت صرف پوسٹ مین کی سمجھی گئی اور بس۔

اگر کبارِ صحابہ میں احادیث کو تشریعی حیثیت نہ دی گئی تھی تو آں حضرت صلعم کی وفات کے موقع پر جب مقامِ تدفین کی تعیین میں اختلاف ہوا تو ابوبکر صدیق رضؓ نے کیوں فوراً اِس حدیث سے استدلال کیا کہ "نبی جس مقام پر وفات پاتا ہے، وہیں دفن بھی ہوتا ہے۔" اور پھر تمام صحابہ رضؓ اس دلیل کے آتے پر اختلاف کو ختم کرکے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

اگر احادیث شرعی اوامر کی حیثیت سے قابلِ اتباع اور لائقِ تعمیل نہ تھیں تو نبیِ کریم صلعم کی وفات کے بعد، فدکؔ اور خیبرؔ کی اراضی کی نسبت حضرت ابوبکر رضؓ نے حضرت عباس رضؓ اور حضرت فاطمہ رضؓ اور ازواجِ مطہرات کو کیوں ناخوش کیا، اور وراثت نافذ نہ کی؟ صرف اس بناء پر کہ حضورؐ کا ارشاد ہے۔ "نبی کا جو ترکہ ہو وہ صدقہ ہے۔"

اور اسی پر عمر رضؓ اور خلفاء عامل رہے اور یہ مسئلہ اہلِ تشیُّع اور اہلِ سُنت کے لیے ایک معرکۃ آلارا مسئلہ بن گیا۔

سچی اور واقعی بات یہ ہے کہ :

اِذَا کَانَ الْغُرَابُ دَلِیْلَ قَوْمٍ
سَیَہْدِیْہِمْ طَرِیْقَ الْھَالِکِیْنَا

اس قسم کے لاکھوں واقعات سے ائمۂ متقدمین کی بیش بہا کارگزاریاں بھری پڑی ہیں اور اس مسئلۂ خاص میں یعنی اسلامی شریعت میں حدیث کے مقام اور حجیّت کے بارے میں تمام امت میں اتحادِ فکر پایا جاتا تھا۔ ہم نے بطورِ مثال چند مشہور واقعات کا ذکر اس موقع پر کر دیا ہے جس کو تفصیل مطلوب ہو وہ آثار و سِیَر کے ذخیروں کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ بہرحال اِس سلسلہ کے وزنی اور وقیع دلائل کا انکار اور قرونِ اولیٰ کے اصحاب اور منکرینِ دینِ متین کو طیش مزاجی اور ہٹ دھرمی کے ساتھ گمراہ بتانا، دراصل اپنی عقل کے دیوالیہ ہونے کا اعلان کرنا ہے۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ منکرینِ حدیث ردِّ احادیث پر جس قدر روایتیں اور آثار پیش کرتے ہیں، ان میں ایک روایت لَا تَکْتُبُوْا عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْاٰنِ کے علاوہ کوئی روایت بھی حدیث کی کتاب کی نہیں، سب رجال کی کتب کی روایات ہیں اور لا تکتبوا عنی مجھ سے قرآن کے علاوہ احادیث نہ لکھو۔ یہ روایت کتابتِ احادیث کی ممانعت کو چاہتی ہے اور کتابتِ احادیث کی ممانعت اس امر کو مستلزم نہیں کہ احادیث محفوظ نہ ہوں اور نہ ہوتی ہوں۔ اور کتابت کی ممانعت سے یہ کیسے لازم آیا اور یہ نتیجہ کیونکر برآمد ہوا کہ احادیث حجّتِ شرعیہ نہیں۔ اس کے علاوہ کتابت کی ممانعت بھی وقتی تھی، پھر کتابت کی اجازت دی گئی اور اکثر صحابہ رضؓ اور جمہور تابعین کا کتابت کے جواز پر اجماع ہوا۔

غرض مذکورہ روایت کے علاوہ اور کوئی روایت حدیث کی کتابوں میں سے کسی کتاب میں منقول نہیں۔ یہ سب روایتیں جو بیان کی جاتیں، اسمار الرجال کے فن میں مذکور ہیں۔ حدیث کی تمام کتابوں میں سے ایک میں بھی ان کا پتہ نہیں، اور فن میں اہلِ فن کی روایت قابلِ اعتبار اور قابلِ وثوق سمجھی جاتی ہے نہ کہ دوسرے فن کی۔ بالکل بدیہی بات ہے کہ ہر کام میں اس کے جاننے والے کی رائے معتبر ہوتی ہے۔

اِس سے یہ غرض نہیں کہ جن کتابوں میں یہ روایتیں ہیں وہ کتابیں معتبر اور مُستند نہیں، بلکہ یہ غرض ہے کہ ایک ایسے مسئلہ میں جس میں خلفاً عن سلفٍ کوئی اختلاف نہ ہو، ایسی کتاب کی روایت کو پیش کرنا جو حدیث کی کتاب نہ ہو کیسے صحیح و درست ہو سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بیرسٹر کی قانونی عبارت اور اس کی تعبیر و تشریح کے بارے میں کوئی شخص یہ کہے کہ اس عبارت کی فلاں جنتری میں جو وضاحت کی گئی ہے وہ اس ماہر قانون بیرسٹر کی تشریح سے زیادہ مدلّل اور وقیع ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہر ذی عقل اس کی مخالفت کریگا۔ اور ہر سلیم الطبع آدمی کے نزدیک ایسی بات خندہ آور اور مضحکہ خیز ہی ہوگی۔ اسی طرح جملہ وہ روایتیں جو انکارِ حدیث اور ردِّ حدیث پر اسماالرّجال سے بیان کی جاتی ہیں، قابلِ التفات نہیں۔ اس وجہ سے کہ ان کا مطمحِ نظر اس کتاب میں صحت و سُقمِ روایت بیان کرنا نہیں بلکہ احوالِ رجال پر تبصرہ کرنا ہے۔ یہ امر حدیث کی کتابوں سے روشن و واضح ہو سکتا ہے اور حدیث کی کتابوں میں کہیں ان روایات کا پتہ نہیں، بلکہ ہر حدیث کی کتاب میں اعتصام بالسنّتہ کی روایات

موجود ہیں۔ چھوٹی سے لے کر بڑی تک، ادنیٰ طبقہ سے اعلیٰ تک اس سے خالی نہیں۔
جن خلفاء سے بیانِ احادیث پر انکار نقل کیا، انہی سے تواترِ عمل بالحدیث اور تمسک بالحدیث ثابت ہے۔ اس لیے یہ جرحِ خفی ہی ان کے رَد کے لیے کافی و وافی ہے۔
پھر اگر اکثر روایات تذکرۃ الحفاظ کی ہیں، تو تذکرہ میں حافظ ذہبی نے خود کہہ دیا ہے کہ:
اِنَّ مُرَادَ الصِّدِّیْقِ التَّثَبُّتُ فِی الْاَخْبَارِ وَالتَّحَرِّیْ لَا سَدُّ بَابِ الرِّوَایَۃِ
"حضرت ابوبکر رضؓ کا مقصود روایات میں احتیاط اور سوچ سمجھ سے کام کرنا ہے نہ کہ بابِ روایات کو بالکل بند کرنا۔"
اس کے علاوہ یہ ہے کہ جو روایتیں ہم نے بیشتر تحریر کیں اور اس کے علاوہ جو بیان کی جاتی ہیں، ان میں سے کسی ایک روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حدیث حجّت نہیں۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کام محض رسالتِ ڈاک کا تھیلہ پہنچانا ہے اور بس۔
واقعہ نمبر اوّل میں حضرت ابوبکر رضؓ نے اِنَّکُمْ تُحَدِّثُوْنَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلعم اَحَادِیْثَ تَخْتَلِفُوْنَ فِیْھَا" تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو، جن کے درمیان تم لوگوں میں اختلاف ہوتا ہے" اس کے بعد احادیث بیان کرنے کی ممانعت فرمائی، تو معلوم ہوا کہ ممانعت ان احادیث کی فرمائی جو اختلاف کا موجب ہوں، کیونکہ ہر حکم اپنی علّت پر دائر ہوگا۔ اس سے تو مطلقاً احادیث بیان کرنے کی بھی ممانعت ثابت نہیں ہوتی، یہ تو کسی صورت بھی ثابت نہیں ہو سکتا کہ حدیث حجّتِ شرعیہ نہیں۔ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ۔

واقعہ نمبر دوم میں حضرت عمر رضؓ کا قرظہ کو عراق بھیجنا، اور روانہ کرنے سے قبل ہدایات دیتے ہوئے یہ فرمانا کہ تم اہلِ عراق کو احادیث میں مشغول کر کے قرآن سے غافل نہ کر دینا۔ اس روایت سے عدم حجیّتِ حدیث پر استدلال کرنا صرف غلط ہی نہیں، بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ اگر یہ مقصود ہوتا کہ حدیث حجت نہیں، تو اِس روایت کے آخر میں یہ الفاظ بھی تو موجود ہیں کہ رسول اللہ صلعم سے کم روایت کرو، تو کیا "کم" تو حجت ہے اور "زائد" حجت نہیں؟ بلکہ حضرت عمر رضؓ کو روایاتِ حدیث کے بارے میں احتیاط مقصود ہے، کیونکہ بسا اوقات زیادتی بے احتیاطی کو مستلزم ہو جاتی ہے۔ یا یہ مقصود ہے کہ تم ان کو حدیث کے مشغلہ میں لگا کر قرآن سے غافل نہ کر دینا۔ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت عمر رضؓ نے اس بات کو غنیمت سمجھا کہ عراق کے لوگ باوجود نو مُسلم ہونے کے قرآنِ پاک کے دلدادہ ہیں اور تعلیم قرآن کا اُن میں چرچا ہو گیا۔ ذرا انصاف سے الفاظِ حدیث پر غور فرمایئے۔

واقعہ سوم اور چہارم اور پنجم میں کثرتِ روایات کی روک تھام تھی حضرت عمر رضؓ نے کام سُپرد فرما رکھے تھے اور تقسیم عمل کے طور پر ہر ایک کا دائرہ کار علیحدہ تھا۔ اور ہر ایک کو ہر شعبۂ کار میں دخل در معقولات کی عموماً اجازت نہ تھی۔ حدیث میں غایت احتیاط تھی۔ بلا شہادت قبول نہ فرماتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

واقعہ ششم میں عدمِ کتابت کی وجہ اختلاط بالقرآن خود بیان کر دی تو اس سے عدم حُجیّت کس طرح ثابت کی جا سکتی ہے۔

واقعہ ہفتم میں تو خود حدیث کا حجت ہونا ہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ صحیفہ حضرت علی رضؓ میں احادیث ہی تو تھیں۔

واقعۂ ہشتم کے متعلق تو تذکرۃ میں خود موجود ہے لَا یَصِحُّ ذَالِکَ یعنی یہ روایت صحیح نہیں، اس کی سند میں ابراہیم بن عمر مجہول ہے۔

تلامذۂ صحابہؓ اور احادیث کا تحریری ذخیرہ

خود صحابۂ کرام رضؓ سے جن لوگوں نے روایت کی ان کو اگرچہ عبداللہ بن مسعودؓ لکھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن اکثر صحابہ رضؓ کتابتِ حدیث کو جائز سمجھتے تھے۔

حضرت عمر رضؓ نے عام حکم دیا تھا قَیِّدُوا الْعِلْمَ بِالْکِتَابِ یعنی علم (حدیث) کو لکھ لیا کرو۔

بشیر بن نہیکؒ کا بیان ہے کہ میں حضرت ابوہریرہ رضؓ سے جو کچھ سُنتا تھا، لکھ لیتا تھا۔ جب اُن سے رخصت ہونے لگا تو اس مجموعہ کو دکھالیا اور انہوں نے اس کی تصدیق کی۔

سعید بن جبیر فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے ساتھ رات کو مکہ کے راستہ میں چلتا تھا۔ وہ حدیث بیان کرتے تھے تو میں اپنے کجاوے کی لکڑی پر لکھ لیتا تھا پھر صبح کو صاف کر لیتا تھا۔ حضرت براء رضؓ کے تمام تلامذہ قلم سے اپنی ہتھیلیوں پر لکھتے تھے۔ حضرت نافع حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ کی تمام حدیثیں ان کے سامنے لکھ لیا کرتے تھے۔ (دارمی)

حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ نے ایک شخص کو خود حدیث لکھوائی، اور اُس نے لکھ لی۔ (مُسند)

حضرت زید بن ثابتؓ حدیثوں کے لکھنے کے مخالف تھے، لیکن مروان بن حکم رضؓ

نے ان کو اپنے یہاں بلوا کر بیچ میں ایک پردہ ڈال دیا اور ایک شخص کو مقرر کر دیا کہ جو حدیثیں وہ بیان کریں ان کو چپکے سے لکھتا جائے۔ (دارمی)

غرض اس طرح صحابۂ کرام رضؓ کے ہی زمانہ میں ایک معتد بہ ذخیرۂ حدیث مدوّن ہو چکا تھا اور حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز رحؒ نے انہی اجزاء پریشاں کو ایک مجموعہ کی صورت میں جمع کر دیا۔

مدارجِ حدیث

حدیث کے مختلف مدارج ہیں بعض روایتیں متواتر ہوتی ہیں یعنی ان روایات کو ایک جمِ غفیر روایت کرتا ہو، ہر زمانہ میں بکثرت روایت ہو، بعض روایتیں مشہور ہوتی ہیں وہ اگرچہ درجۂ تواتر کو نہیں پہنچتیں تاہم بکثرت لوگ ان کی روایت کرتے ہیں۔ بعض حدیثوں کی روایت کا سلسلہ چند اشخاص تک محدود رہتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات ایک ہی شخص کسی حدیث کی روایت کرتا ہے۔ اس اختلافِ مدارج کا اثر ان فقہی احکام پر پڑتا ہے جو ان حدیثوں میں مذکور ہوتے ہیں یا ان سے مستنبط کیے جاتے ہیں۔ قطعیت کے لحاظ سے خبرِ احاد متواتر یا مشہور روایتوں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس بنا پر فقہا میں اختلاف ہے کہ خبرِ احاد کے ذریعہ سے قرآن مجید کے کسی حکمِ عام کی تخصیص یا تنسیخ ہو سکتی ہے یا نہیں۔ امام شافعی رحؒ اور اکثر محدثین کا مذہب ہے کہ خبرِ احاد کے ذریعہ سے قرآن مجید کے کسی حکمِ عام کی تخصیص بلکہ تنسیخ کی جا سکتی ہے۔ اور معتزلہ روایاتِ احاد کے تسلیم کرنے سے قطعاً منکر ہیں لیکن یہ درحقیقت انکارِ بداہت ہے۔ ہم روزمرّہ واقعاتِ زندگی میں اس قسم کی روایات پر اکثر بلا حجّت و اصرار فوراً یقین کر لیتے ہیں۔ ہم سے ایک شخص آ کر کہتا ہے کہ

زید تم کو بلاتا ہے اور ہم فوراً اٹھ کر چلے جاتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ یہ خبرِ واحد ہے ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ معتزلہ کے مقابلے میں اکثر محدثین خبرِ واحد کی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں۔ حنفیہ بین بین ہیں نہ معتزلہ کی طرح منکر ہیں اور نہ محدثین کی طرح قطعیت کے قائل ہیں بلکہ ظنی الثبوت مانتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ روایاتِ احاد کی صحت اور عدمِ صحت یا ظنّ و قطعیت رواۃ کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کے بعد خود اصل روایت کی اہمیت اور عدمِ اہمیت پر مبنی ہے۔ ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے کہ زید نے تم کو بلایا ہے تو راوی کی ثقاہت و اعتبار کے علم ہونے کے بعد پھر ہم کو بھی اس واقعہ کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہی شخص یہ کہتا ہے کہ تم کو بادشاہ نے آج دربار میں بلایا ہے تو ہم اِس واقعہ کے تسلیم کرنے میں پس و پیش کرتے اور اس کے ثبوت کے لیے دوسروں کی شہادت تلاش کرتے ہیں۔

ہاں یہ ممکن ہے کہ اگر کسی کے پاس خبرِ واحد پہنچی ہو تو اس نے اس پر اس لیے عمل نہ کیا ہو کہ اس کے نزدیک وہ خبر حدِ صحت کو نہ پہنچی ہو یا وہ حدیث دو معنیٰ کو محتمل ہو اور اس نے دوسرے معنیٰ پر عمل کیا ہو، یا اس کے معارض اس سے زائد صحیح اس کے پاس موجود ہوں۔ غرض جب تک وجوہِ ترجیح یا اسبابِ ترک میں سے کوئی سبب اُس کے پاس موجود نہ ہو، ہرگز کسی کو خبرِ واحد کا محض خبرِ واحد ہونے کے باعث ترک جائز نہیں۔

غور فرمایئے قرآنِ پاک کا کلامِ الٰہی ہونا ہم کو صرف خبرِ واحد سے معلوم ہوا۔ لیکن رسولِ کریم صلعم کے صدق و راست بازی پر نظر کر کے تصدیق کو تکذیب پر

ترجیح دی گئی ہے۔ اگر خبرِ واحد کا ہی انکار کر دیا جائے تو کسی کا اپنے کو صحیح النسب ہونا اور اپنے والدین کے تعلقاتِ زن و شوئی کا جائز و شرعی ثابت کرنا بھی محال ہو جائے گا۔

امام شافعیؒ نے اپنے رسالہ میں اِس پر ایک مستقل مقالہ لکھا ہے اور آنحضرتؐ کے زمانہ ہی کے واقعات سے خبرِ واحد کی حجیّت ثابت کی ہے۔

۱۔ تحویلِ قبلہ سے قبل سب بیتُ المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے، اور جب قبلہ بدلا اور آنحضرتؐ کا قاصد تحویلِ قبلہ کی خبر لے کر اہلِ قبا کے پاس پہنچا اور وہ نماز میں تھے، تو قاصد نے اعلان کیا الا ان القبلة قد حولت کہ قبلہ بدل گیا۔ تو سب نے نماز ہی کے اندر اپنا رُخ بدل دیا۔ یہ غور نہ کیا کہ یہ خبرِ واحد ہے اس پر کیسے عمل کریں اور نہ نبی کریمؐ نے ان کے اِس عمل پر کوئی انکار فرمایا۔

حدیث کی کتابوں میں اِس نوع کے واقعات کثیر ہیں، امام شافعی صاحبؒ نے اپنے رسالہ میں متعدد واقعات تحریر فرمائے ہیں۔

۲۔ حضورؐ نے عامل اور قاصد جہاں جہاں روانہ فرمائے ہیں اس میں عدد کا کوئی لحاظ نہیں فرمایا۔ لیکن کہیں منقول نہیں کہ آپ کے عاملین کے ساتھ کسی نے یہ مناقشہ کیا ہو کہ چونکہ یہ ایک ہی فرد ہے اس لیے اس کو عُشر و صدقات نہ دیئے جائیں گے۔

۳۔ اسی طرح آپ نے دعوتِ اسلام کے لیے مختلف بلاد میں بارہ قاصد روانہ فرمائے اور صرف اِس بات کی رعایت کی کہ ہر سمت میں ایسا شخص روانہ کیا جائے جو اس نواح میں متعارف ہو تاکہ اس کے جھوٹے ہونے کا شبہہ نہ ہو اور اس پران کو اطمینان ہو کہ وہ حضورؐ کا قاصد ہے۔

۴۔ مسلمانوں میں ہمیشہ ایک ہی خلیفہ، ایک ہی قاضی، ایک ہی امام، ایک ہی امیر ہونا مسلّم مسئلہ تھا اور کوئی اختلاف نہ تھا۔

۵۔ امام شافعی صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ میں نے مکہ، مدینہ، یمن، شام اور کوفہ کے حضرات کو دیکھا کہ وہ آنحضرت ؐ کے ایک صحابی سے روایت کرتے تھے اور صرف ایک صحابی کی حدیث سے سنت ثابت ہو جاتی تھی۔ غرض تمام بلادِ اسلامیہ اسی عقیدہ پر تھے۔ کہ خبرِ واحد حجت ہے۔ امام شافعی رح کا ارشاد ہے کہ یہ وہ عقیدہ ہے جس پر ہم نے اُن لوگوں کو پایا ہے، جن کو ہم نے دیکھا ہے اور یہی عقیدہ انہوں نے اپنے پہلوں کا ہم سے بیان کیا۔

اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اکثر احادیث اخبار احاد ہیں۔

طبقاتِ صحابہؓ

اگرچہ ابوزرعہ محدّث کے قول کیمطابق صحابہ کی تعداد لاکھوں سے متجاوز تھی، تاہم علامہ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں جن صحابہ کا تذکرہ کیا ہے اور جن کی نسبت لکھا ہے کہ صحاح میں ان سے حدیثیں مروی ہیں، ان کی تعداد صرف ایک سو پانچ ہے لیکن تفحص و تلاش سے ان میں اور صحابہ کے ناموں کا بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مسندِ ابوداؤد طیالسی جو دوسری صدی کے آخر میں تالیف ہوئی اور اس میں تقریباً ڈھائی سو صحابہ سے روایتیں ہیں۔

علامہ ذہبی کی رائے کے مطابق اِن ایک سو پانچ صحابہؓ میں اٹھائیس صحابہ ایسے ہیں جن کے نام سے علم حدیث کے اکثر صفحات مزین ہیں۔ لیکن ان اٹھائیس صحابہ میں عام محدّثین کی تصریح کے مطابق چھ صحابہ رضؓ سب سے زیادہ کثیر الروایات

ہیں اور علمِ حدیث میں نصف سے زیادہ انہی کی روایتیں ہیں اور چونکہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس نے کم سے کم چالیس حدیثیں بھی میری امّت کو پہنچا دیں، اس کا حشر علماء کے ساتھ ہوگا۔ اس لیے محدّثین نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ جن کی روایتیں چالیس سے کم ہوں گی وہ قلیل الروایت شمار کیے جائیں گے۔ اِس بنا پر قلت وکثرتِ روایت کی حیثیت سے محدّثین نے صحابہ رضؓ کے چار طبقے قرار دیئے ہیں:

۱۔ پہلا طبقہ: وہ صحابہ رضؓ جن کی ہزار یا ہزار سے زیادہ روایتیں ہیں۔

۲۔ دوسرا طبقہ: وہ صحابہ رضؓ جن کی روایتیں پانچ سو یا پانچ سو سے زیادہ ہیں۔

۳۔ تیسرا طبقہ: وہ صحابہ رضؓ جن کی روایتیں چالیس یا چالیس سے زیادہ ہیں۔

۴۔ چوتھا طبقہ: وہ صحابہ رضؓ جن کی روایتیں چالیس یا چالیس سے کم ہیں۔

لیکن چونکہ پانچ سو سے چالیس تک کے رواۃ زیادہ ہیں اس لیے ہم نے ان کے دو حصے کر لیے ہیں۔ ۱۰۰ سے پانچ سو تک اور چالیس سے ۱۰۰ تک دوسرا طبقہ۔ اِس تفصیل کی رُو سے ہم نے صحابہ رضؓ کے پانچ طبقے قرار دیئے ہیں:

۱۔ وہ صحابہ رضؓ جن کی روایتیں ہزار یا ہزار سے زیادہ ہیں۔

۲۔ وہ صحابہ رضؓ جن کی روایتیں پانچ سو یا پانچ سو سے زیادہ ہیں مگر ہزار سے کم۔

۳۔ وہ صحابہ رضؓ جن کی روایتیں ۱۰۰ یا ۱۰۰ سے زیادہ ہیں مگر پانچسو سے کم۔

۴۔ وہ صحابہ رضؓ جن کی روایتیں چالیس یا چالیس سے زیادہ ہیں۔ مگر ۱۰۰ سے کم۔

۵۔ وہ صحابہ رضؓ جن کی روایتیں چالیس سے کم ہیں۔

تمام محدثین اگرچہ پہلے طبقے میں صرف چھ صحابہ رضؓ حضرت ابوہریرہ رضؓ، حضرت عائشہ رضؓ، حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ، حضرت عبداللہ ابن عمر رضؓ، حضرت جابر بن عبداللہ رضؓ، حضرت انس بن مالک رضؓ کو داخل کرتے ہیں۔ لیکن شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے کثیر الروایات صحابہ رضؓ میں آٹھ بزرگوں کا نام لیا ہے چنانچہ ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں:

"صحابہ رضوان اللہ علیہم باعتبار کثرت و قلت روایت حدیث بر چہار طبقہ اند مکثرین کہ مرویات ایشاں ہزار حدیث فصاعدا یا زیادہ او د متوسطین کہ مرویات ایشاں پانصد حدیث باشد مثل ابو موسیٰ رضؓ و براء بن عازبؓ و جمعیکہ مرویات ایشاں چہل حدیث باشد فصاعدا تا سہ صد و چہار صد در حدیث شریف آمدہ است من حفظ علی امتی اربعین حدیثا حشر مع العلماء و کما قال و مقلین کہ مرویات ایشاں تا چہل نمی رسد جمہور محدثین گفتہ اند کثیر الروایت از صحابہ رضؓ ہشت کس اند ابوہریرہ و عائشہ و عبداللہ بن عمرؓ و عبداللہ بن عباسؓ و عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ و انسؓ و جابرؓ و ابو سعید خدری رضؓ"

لیکن شاہ صاحبؒ کا دعوے محدثین کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے چنانچہ ابن صلاحؒ لکھتے ہیں:

عن احمد بن حنبل قال ستۃ من اصحاب النبی کثیر الروایۃ عنہ و عمروا ابوھریرۃ رضؓ و ابن عمرؓ و عائشۃ رضؓ و جابر بن عبداللہ و ابن عباس رضؓ

"امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا ہے کہ چھ صحابہ رضؓ کثیر الروایت ہیں اور انہوں

نے طویل عمر پائی ہے (وہ یہ ہیں) ابوہریرہ رضؓ۔ ابنِ عمر رضؓ۔ عائشہ رضؓ۔ جابر رضؓ۔ ابنِ عباس رضؓ اور انس رضؓ۔"

علامہ عینی حضرت عائشہ رضؓ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

وکانت واحد الستۃ الذین ھم اکثر الصحابۃ روایۃ "حضرت عائشہ رضؓ اُن چھ صحابہ میں تھیں جو کثیر الروایت ہیں۔"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ عام محدثین نے حضرت ابوسعید خدری رضؓ کا نام ——— کثیر الروایت صحابہ کے ساتھ نہیں لیا، حالانکہ ان کی مرویات ایک ہزار سے زائد ہیں۔ جیسا کہ صاحب خلاصہ تذہیب التہذیب نے بیان کیا ہے اور شاہ صاحبؒ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کو طبقۂ اول میں داخل کرتے ہیں، حالانکہ ان کی روایتوں کی تعداد صرف سات سو ہے۔

اِس بنا پر کثیر الروایت صحابہ جن کا نام طبقۂ اوّل میں رکھا جا سکتا ہے سات ہیں:

طبقۂ اوّل

وہ صحابی جن کی روایتیں ہزار یا ہزار سے زیادہ ہیں:

۱۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ ان کے نام میں بہت اختلاف ہے زیادہ مشہور دو قول ہیں۔ عبدالرحمٰن اور عبداللہ، لیکن کنیت ابوہریرہ کا اس درجہ غلبہ ہو گیا تھا کہ اسم مجہول اور نامعلوم بن گیا تھا۔ یہ قبیلہ اَوس سے تعلق رکھتے تھے۔ ۷ھ میں غزوۂ خیبر کے بعد رسول اللہ صلعم کی خدمت میں ہجرت کر کے آئے اور تا وفات حضور صلعم کی صحبت میں رہے اور آپؐ سے بہ کثرت حدیثیں روایت کیں۔ صحاح ستہ میں ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے۔ تین سو پچیس

کی تخریج پر بخاری و مسلم متفق ہیں۔ ۹۳ کی تخریج میں امام بخاری اور ۹۲ کی تخریج میں امام مسلم منفرد ہیں۔ اور ان سے آٹھ سو تابعین نے روایات حدیث لیں اور بیان کیں۔ سب سے زیادہ سعید ابن المسیب اُن کے داماد اور انکے مولیٰ اعرج نے اور مدینہ کے کبار تابعین نے ان سے بکثرت حدیثیں لیں۔

بڑے جلیل القدر، عبادت گزار اور متواضع و خاکسار تھے اور صحابہ میں سب سے زیادہ حافظ الحدیث اور عالم حدیث تھے۔ حضرت ابنِ عمر رضہ نے فرمایا کہ "اے ابوہریرہ تم ہم سب سے زیادہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، اور ہم سب سے زیادہ آپ کی حدیثوں کا علم رکھتے تھے۔

ابنِ سعد کا بیان ہے کہ روزانہ بارہ ہزار نفل پڑھتے تھے۔ واقدی کے قول کے مطابق ۵۹ھ ۷۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

۲۔ حضرت عبداللہ بنِ عباس رضہ۔ حضور صلعم کے چچا زاد بھائی، ترجمان القرآن، ہجرت سے دو سال پہلے پیدا ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے یہ دُعا کی کہ "خدا ان کو دین میں فقیہہ بنا دے اور ان کو تفسیر سکھا دے۔" امیر المومنین حضرت عمر رضہ مشکل مسائل میں ابنِ عباس رضہ سے بھی مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ اگر ابنِ عباس رضہ کسی راستے سے گزرتے تو وہ خوشبودار ہو جاتا اور اشتباہ ہوتا کہ ابنِ عباس رضہ گزرے یا خوشبو چھڑکی گئی۔

مسروق کا قول ہے کہ میں جب ابنِ عباس رضہ کو دیکھتا تو کہتا کہ سب سے زیادہ حسین ہیں۔ اور جب وہ کلام فرماتے تو کہتا کہ سب سے زیادہ فصیح ہیں اور جب حدیث بیان فرماتے تو کہتا کہ سب سے زیادہ حدیث کے جاننے والے ہیں۔ غرض بہت سی

خوبیوں کے حامل تھے۔

صحاحِ ستہ میں ان سے دو ہزار چھ سو ساٹھ حدیثیں مروی ہیں۔ ۵۷ کی تخریج پر بخاریؒ و مسلمؒ متفق ہیں اور ۲۸ کی تخریج میں بخاری اور ۴۹ میں مسلم منفرد ہیں۔ ان سے زیادہ روایتیں ابو الشعثاءؒ، ابو العالیہؒ، سعید بن الجبیرؒ اور سعید بن المسیبؒ اور عطار بن یسارؒ نے لی ہیں۔

محققین کا خیال ہے کہ انہوں نے حضورؐ سے بلا واسطہ ۲۵ حدیثیں سُنی تھیں اور بالواسطہ اور صحابہ سے سُنی ہیں۔ لیکن مرسلاتِ صحابی کا حجت ہونا سب کو تسلیم ہے اور متفق علیہ مسئلہ ہے۔

انہوں نے ۶۸ھ میں مقام طائف میں انتقال فرمایا۔

۳۔ اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی بیٹی اور آں حضرت صلعم کی زوجۂ مطہرہ ہیں۔ آپؐ نے ہجرت سے دو سال پہلے ان سے نکاح کیا۔ اور اس وقت ان کی عمر سات سال کی تھی اور نو سال کی عمر میں وہ مدینہ میں آپؐ کے گھر آئیں۔ وہ تمام ازواجِ مطہرات میں آپؐ کی محبوب ترین بیوی تھیں۔ رسول اللہ صلعم جس طرح پر اپنے گھر کے اندر پرائیویٹ زندگی گزارتے تھے اس کے متعلق حضرتِ عائشہ رضؓ ہی کی روایات پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ فقہاء صحابہ انہی کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے بہت سے صحابہ اور تابعین نے حدیث کی روایت کی۔

صحاحِ ستہ میں ان سے ۲۲۱۰ روایتیں مروی ہیں، ۱۷۴ کی تخریج پر بخاری و مسلم متفق ہیں اور ۵۴ روایتوں میں امام بخاری رح اور ۶۸ کی تخریج میں امام مسلم رح منفرد ہیں۔ ان سے مسروق، اسود، عروہ، قاسم بن محمد، سعید بن المسیب اور عمرہ نے

بکثرت روایتیں لی ہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ نے ۵۷ ہجری میں وفات پائی۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضؓ۔ امیرالمومنین عمر بن الخطاب رضؓ کے صاحبزادے ہیں اور بچپن ہی میں قبلِ بلوغ اپنے باپ کے ساتھ اسلام لائے۔ وہ مسلمانوں کے امام اور مشہور مُفتیوں میں تھے۔ وہ فتوے اور اپنے نفس کی مرغوبات میں نہایت محتاط اور اپنے دین کے محافظ تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلعم سے بکثرت حدیثیں روایت کیں اور کبار صحابہ رضؓ سے بھی احادیث کی روایت کی۔

صحاحِ ستّہ میں ان سے ۱۶۳۰ حدیثیں مروی ہیں جن میں ۱۷۰ کی تخریج پر بخاریؒ و مسلم رحؒ متفق ہیں اور ۸۱ حدیثوں میں امام بخاری رحؒ اور ۳۱ میں امام مسلمؒ منفرد ہیں۔

ان سے سالمؒ، حمزہؒ، عبیداللہؒ ابن المسیبؒ اور نافعؒ نے بہ کثرت روایاتِ احادیث بیان کی ہیں۔ انہوں نے ۷۴ھ میں انتقال کیا۔

۵۔ حضرت جابر بنِ عبداللہ رضؓ۔ یہ مشہور مدنی صحابی ہیں۔ اُنیس[19] غزوات میں شریک ہوئے۔ ان کا بیان ہے کہ لیلۃ البعیر میں ان کے لیے پچیس[25] مرتبہ دعاءِ استغفار کی۔ صحاح ستّہ میں ان سے ایک ہزار پانچ سو چالیس حدیثیں مروی ہیں۔ ۵۸ کی تخریج پر شیخین متفق ہیں اور ۱۶ کی تخریج میں امام بخاری رحؒ اور ۲۶ کی تخریج میں امام مسلم رحؒ منفرد ہیں۔

ان سے طاؤس اور شعبی اور عطاء اور دوسرے کثیر تابعین نے روایتِ حدیث کی۔ مدینہ میں ۷۴ ہجری میں بہ عمر ۹۴ سال انتقال فرمایا۔

۶۔ انس بنِ مالک رضؓ انصاری۔ آں حضرت صلعم کے خادم تھے۔ مدّتوں رسول اللہ صلعم

کی خدمت میں رہے۔ ان سے بہ کثرت حدیثیں مروی ہیں۔ صحاحِ ستہ میں ان سے ۱۲۸۶ روایتیں منقول ہیں۔ امام بخاری رح نے ان کی ۸۳ حدیثیں اور امام مسلم رح نے ۷۱ حدیثوں کی روایت کی ہے اور دونوں نے ان کی ۱۲۸ حدیث کی روایت کی ہے۔ ان سے موسیٰ بن انسؓ، نضر بن انسؓ، ابوبکر بن انسؓ، حسن بصریؒ، ثابت بنانیؒ اور سلیمان تیمیؒ نے بکثرت احادیث کی روایت کی۔ ۹۰ھ یا اس کے بعد ۱۰۰ سال سے متجاوز عمر میں وفات پائی۔ اور بصرہ میں سب سے آخری صحابی تھے۔

۷۔ حضرت ابوسعید خدری رضؓ۔ ان کا سعد بن مالک نام ہے۔ غزوۂ اُحد کے بعد، جملہ غزوات میں شرکت کی۔ علماء صحابہؓ میں سے تھے۔ ان سے ۱۱۷۰ حدیثیں مروی ہیں۔ امام بخاری رح اور مسلم رح نے ان کی ۴۳ روایتیں لی ہیں اور بخاری ۲۶ اور مسلم ۵۲ روایتوں میں منفرد ہیں۔

ان سے طارق بن شہابؓ، ابن المسیبؒ، شعبیؒ اور نافعؒ وغیرہم نے روایتیں کی ہیں۔ آپ نے ۷۴ ہجری میں انتقال فرمایا۔

طبقۂ دُوم

وہ صحابہ جن کی روایتیں پانچ سو یا پانسو سے زائد ہیں۔ اس طبقہ میں صرف چار صحابی ہیں:

۱۔ عبداللہ بن مسعود رضؓ۔ بنو زہرہ کے حلیف اور قدیم الاسلام ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے اپنے آپ کو چھ مسلمانوں میں چھٹا مسلمان پایا۔ اسوقت سطحِ زمین پر ہم لوگوں کے سوا کوئی اور مسلمان نہ تھا۔ مکہ میں سب سے پہلے انہوں نے باعلان قرآنِ پاک پڑھا۔ جب وہ اسلام لائے تو رسول اللہ صلعم نے ان کو لے لیا اور یہ حضور کی خدمت کرنے لگے۔ ان کو حضور صؐ نے فرمایا کہ تم کو اندر آنے کے لیے اجازت

لینے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری اجازت صرف یہ ہے کہ تم میری بات سن لو اور پردہ اُٹھا ہوا ہو۔ چنانچہ وہ آپؐ کے پاس اندر آتے جاتے، آپؐ کو جوتے پہناتے، آپؐ کے ساتھ اور آپ کے آگے آگے چلتے۔ جب آپؐ غسل فرماتے تو پردہ کرتے، اور جب آپؐ سوتے تو آپؐ کو بیدار کرتے۔ حبشہ اور مدینہ دونوں جگہ ہجرت کی اور دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔ رسول اللہ صلعم کے ساتھ بدرؔ، اُحدؔ، خندقؔ، بیعتِ رضوان اور تمام لڑائیوں میں شریک ہوئے۔

حضرت حذیفہ رضؓ سے کہا گیا کہ ہم کو ایسا شخص بتایئے جو طور و طریقے میں رسول اللہ صلعم سے سب سے زیادہ قریب ہو تاکہ ہم اس سے حدیثیں سُنیں، اور اخذ کریں۔ بولے طرز و روش میں رسول اللہؐ سے سب سے زیادہ قریب ابنِ مسعودؓ ہیں۔ اصحابِ محمد صلعم میں جو لوگ محفوظ ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بنِ مسعود رضؓ سب سے زیادہ مقربِ بارگاہِ نبوی ہیں۔

امیرالمومنین عمر بن الخطابؓ نے ان کو کوفہ بھیجا۔ اور باشندگانِ کوفہ کو لکھا کہ "میں نے عمار بنِ یاسر رضؓ کو امیر اور عبداللہ بنِ مسعود رضؓ کو معلّم اور وزیر بنا کر بھیجا ہے۔ یہ دونوں رسول اللہؐ کے شریف ترین بدری صحابی ہیں۔ ان کی پیروی اور اطاعت کرو اور ان کا کہنا مانو۔ مَیں نے عبداللہ بنِ مسعودؓ کے ساتھ اپنے آپ پر تم کو ترجیح ہے۔" انہوں نے اصل کوفہ کے معلّم اور قاضی کی حیثیت سے وہاں قیام کیا اور وہاں کے باشندے اُن سے اخذِ حدیث کرتے تھے اور ان سے بہت سے صحابہ رضؓ اور تابعین رحؒ نے حدیث کی روایت کی ہے۔

صحاحِ ستہ میں ان سے ۸۴۸ روایتیں مروی ہیں، ۶۴ کی تخریج پر بخاری

اور مسلم متحد و متفق ہیں اور ۸ کے ساتھ بخاری اور ۲۰ کے ساتھ مسلم منفرد ہیں۔ ان کی زائد روایتیں علقمہؒ، مسروقؒ، اسودؒ اور قیس بن ابی حازمؒ اور کبار تابعین سے مروی ہیں۔ مدینہ میں ۳۲ھ میں ساٹھ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضہ۔ آپ رسولِ خدا صلعم کے عہدِ مبارک سے بڑے روزے دار، بڑے نماز گزار، قاری قرآن اور جویانِ علم تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلعم سے سن کر بہت سی حدیثیں لکھیں۔ اور حضرت ابی ہریرہ رضہ ان کی کثرتِ علم کے معترف تھے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضہ نے فرمایا کہ وہ حدیث لکھتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔ نیک اور اپنی دُھن کے پکے تھے۔ فتنہ و فساد میں حصہ لینے پر، اپنے باپ کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کرتے مالی ولقتال المسلمین کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں مسلمانوں سے قتال کروں۔ باپ کی نافرمانی کے باعث قتال میں حصہ نہ لینے کو گناہ خیال فرماتے۔ اس لیے صفین میں شریک ہوئے لیکن تلوار نہیں کھینچی۔

صحاحِ ستہ میں ان سے ۷۰۰ حدیثیں مروی ہیں، ۷ احادیثوں کی تخریج پر شیخین متفق ہیں۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ ۲۰ کے ساتھ منفرد ہیں۔ ان سے جبیرؒ بن نفیر، ابن المسیبؒ، عروہؒ اور طاؤسؒ وغیرہ نے احادیث کی روایت کی ۶۵ھ میں انتقال فرمایا۔

۳۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضورؐ کے چچا زاد بھائی اور داماد ہیں۔ بچوں میں سب سے قبل اسلام لائے۔ اُحد پہاڑ پر جب وہ ہلنے لگا تھا اور حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا، اثبت (تھم جا ٹھہر جا) اس وقت حضرت علی رضہ موجود تھے۔

جب یمن میں قاضی بنا کر بھیجا تو حضرت علی رضہ نے کہا کہ مجھے قضا کے متعلق علم نہیں۔ حضور صلعم نے آپ کے سینہ پر ہاتھ مارا اور یہ دعا فرمائی

حضرت علی رضؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد دو آدمیوں کے درمیان مجھے قضا میں کبھی شک و شبہہ نہیں ہوا۔ حضور صلعم نے ارشاد فرمایا تھا کہ اے علیؓ تو میری عدم موجودگی میں ایسا قائم مقام ہے جیسے ہارون موسیٰ ؑ کی عدم موجودگی میں تھے۔ لیکن یہ خلافت اہلِ سنت کے نزدیک حالتِ حیات کی تھی۔ اور بہت کثرت سے خوبیاں ہیں۔ صحاحِ ستہ میں ان سے ۵۸۶ حدیثیں مروی ہیں، ۲۰ کی تخریج بخاری اور مسلم دونوں نے متفق طور پر کی۔ اور ۵ حدیثوں میں مسلم اور ۹ میں بخاری منفرد ہیں۔ ان سے زائد روایتیں امام حسنؓ امام حسینؓ محمدؒ، عمر اور ابنِ عباسؓ نے لی ہیں۔ آپ شبِ جمعہ ماہِ رمضان ۴۰ ہجری میں شہید ہوئے۔

۴۔ حضرت عمر بن الخطابؓ۔ امیر المومنین اور ثانی خلیفۂ مسلمین، چالیس آدمیوں کے بعد اسلام لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالےٰ نے حق امر کو عمرؓ کی زبان اور دل پر کیا۔

صحاحِ ستہ میں ان سے ۵۳۹ احادیث مروی ہیں جن میں سے ۹ بخاری میں اور ۱۵ مسلم میں اور ۱۰ دونوں میں ہیں۔ ان سے عبداللہ اور عبید اللہؓ اور عاصمؓ اور علقمہؒ بن وقاصؓ وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ۶۳ سال کی عمر پاکر ۲۳ ہجری میں شہید ہوئے۔

طبقۂ سوم

وہ صحابہ رضؓ جن کی روایتیں سو یا سو سے زیادہ ہیں مگر پانچ سو سے کم ہیں۔ اس طبقہ میں ۲۶ صحابہ رضؓ ہیں۔

۱۔ ام المومنین ام سلمہ رضؓ۔

اِن کا نام ہند ہے، ابو امیہ بن المغیرہ کی لڑکی ہیں۔ صحاحِ ستہ میں ان سے ۲۷۸ حدیثیں مروی ہیں۔ ۱۲ حدیثوں کی تخریج پر بخاری اور مسلم متفق ہیں اور تین تین حدیثوں کی تخریج پر بخاری اور مسلم منفرد ہیں۔ ان سے نافعؒ، ابن المسیبؒ اور ابو عثمان ہندیؒ وغیرہم

نے روایت کی۔ ازواجِ مطہرات میں سب سے بعد ۵۹ ہجری میں انتقال فرمایا۔

۲۔ ابو موسیٰ اشعری رضؓ۔

ان کا عبداللہ بن قیس نام ہے۔ حبشہ کو ہجرت کی۔ حضرت عمر رضؓ نے کوفہ اور بصرہ کا والی مقرر فرمایا۔ انہوں نے بہت سے شہر فتح کیے۔ صحاح میں ان سے ۳۶۰ حدیثیں مروی ہیں، ۵۰ حدیثوں میں بخاری اور مسلم متفق ہیں اور بخاری ۴ حدیثوں کی اور مسلم ۲۵ حدیثوں کی تخریج میں منفرد ہیں۔ تاریخِ انتقال میں اختلاف ہے آخری قول ۵۲ ہجری کا ہے۔

۳۔ حضرت برآء بن عازب رضؓ۔

آپ نے کوفہ میں قیام فرمالیا تھا۔ ابو عمارہ ان کی کنیت ہے۔ صحاح میں ان سے ۳۰۵ حدیثیں مروی ہیں۔ ۲۲ کی تخریج پر صحیحین متفق ہیں۔ ۱۵ حدیثوں میں بخاری اور ۶ میں مسلم منفرد ہیں۔ ۷۲ ہجری میں انتقال فرمایا۔

۴۔ حضرت ابو ذر غفاری رضؓ۔

ان کے نام میں اختلاف ہے۔ مشہور جندب بن جنادہؓ ہے۔ فضائل اِنکے کثیر ہیں۔ ابو داؤد کا بیان ہے کہ علم میں ابنِ مسعودؓ کے برابر تھے۔ صحاحِ ستہ میں ان سے ۲۸۱ حدیثیں مروی ہیں، ۱۲ حدیثیں بخاری اور مسلم نے متفقہ طور پر بیان کی ہیں۔ اور بخاری دُو حدیثوں کی اور مسلم ۱۹ حدیثوں کی تخریج پر منفرد ہیں۔

ربذہ میں ۳۲ ہجری میں انتقال کیا۔

۵۔ حضرت سعد بنِ ابی وقاص رضؓ۔

ان کا نام مالک بنِ اہیبؓ ہے۔ ساتویں مسلمان ہیں اور عشرۂ مبشرہ کے ایک فرد ہیں۔ اور عشرۂ مبشرہ میں سب کے بعد وفات پانے والے اور اقامتِ دین کیلئے مسلمانوں

میں سب سے قبل تیر سے زخمی ہونے والے ہیں۔

صحاحِ ستہ میں ان سے ۲۰۰ حدیثیں مروی ہیں، ۱۵ حدیثوں کی تخریج پر بخاریؒ اور مسلمؒ متفق ہیں اور ۹ حدیثوں کی تخریج پر بخاریؒ اور ۱۸ کی تخریج پر مسلمؒ منفرد ہیں۔ آپ نے ۵۵ ہجری میں انتقال فرمایا۔

۶۔ حضرت سہل بنِ سعد انصاری ابوالعباس مدنی۔

صحاح ستہ میں ان کی ۱۸۸ روایتیں ہیں، ۲۸ بخاریؒ اور مسلمؒ میں ہیں اور گیارہ روایتوں میں امام بخاریؒ منفرد ہیں۔ ان سے زہریؒ، ابوحازمؒ اور ابوسہلؒ نے حدیث کی روایت کی ہے۔ بہ عمر سو سال ۹۱ ہجری میں انتقال کیا۔ ابنِ سعدؒ کہتے ہیں کہ مدینہ میں سب سے آخری صحابی تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ سائب بن یزیدؓ آخری صحابی تھے لیکن ان کا سنِ وفات مختلف ہے۔ بعض ۹۱ اور بعض اس سے قبل کہتے ہیں۔

۷۔ حضرت عبادہ بن الصامتؓ انصاری عقبتین کی بیعت میں موجود تھے۔ امیر المومنین عمرؓ نے قرآن و حدیث کی تعلیم دینے کے لیے شام بھیجا تھا۔ صحاح ستہ میں اُن سے ۱۸۰ حدیثیں مروی ہیں۔ چھ حدیثیں صحیحین میں ہیں، ۲ حدیثیں بخاریؒ میں اور دو مسلم میں ہیں۔ امام بخاریؒ کے قول کے مطابق فلسطین میں ۳۴ھ میں انتقال فرمایا۔

۸۔ حضرت ابوالدرداءؓ۔ ان کا نام عویمر بنِ زیدؓ ہے۔ یہ دمشق کے قاضی رہے اور ان کے بہت فضائل ہیں۔ صحاحِ ستہ میں ان سے ۷۹ حدیثیں مروی ہیں۔ ۲ حدیثیں بخاری اور مسلم میں، ۳ بخاری میں اور ۸ مسلم میں ہیں۔

۳۲ھ میں انتقال فرمایا۔

۹۔ حضرت ابوقتادہ انصاریؓ، فارسِ رسول اللہ ﷺ۔ ان کا نام حارث ہے۔

احد و بقیہ غزوات میں شریک ہوئے۔ صحاح ستہ میں ان سے ۷۰ احدیثیں مروی ہیں۔
۱۱ حدیثیں بخاری و مسلم میں، ۲ بخاری میں اور ۸ مسلم میں۔ ۱۸ھ میں مدینہ میں انتقال کیا۔

۱۰۔ حضرت اُبی بن کعبؓ انصاری مدنی سید القراء، کاتب وحی۔ بدر اور دیگر غزوات میں شریک ہوتے رہے۔ صحاحِ ستہ میں ان کی ۶۴ احادیثیں ہیں، ۳ حدیثیں بخاری و مسلم میں، ۴ بخاری میں اور ۷ مسلم میں۔ ۲۰ھ یا اس کے بعد انتقال فرمایا۔

۱۱۔ حضرت بریدہ بن حصیب اسلمیؓ نے مدینہ پھر بصرہ پھر مرو میں سکونت فرمائی۔ صحاحِ ستہ میں ان کی ۱۶۴ حدیثیں ہیں۔ ایک حدیث بخاری و مسلم میں ہے اور ۲ حدیثیں بخاری میں اور گیارہ مسلم میں ہیں۔ خراسان میں انتقال کیا۔

۱۲۔ حضرت معاذ بن جبل رضؓ انصاری خزرجی۔ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ معاذ قیامت کے دن امام العلماء ہوں گے۔ بدر اور جملہ غزوات میں شریک ہوئے، ۱۸ سال کی عمر میں اسلام لائے۔ صحاحِ ستہ میں ان سے ۱۵۰ حدیثیں مروی ہیں۔ دو حدیثیں بخاری و مسلم میں ہیں اور ۳ بخاری میں اور ایک مسلم میں۔

۳۴ سال کی عمر میں ۱۸ھ میں طاعونِ عمواس میں انتقال کیا۔

۱۳۔ حضرت ابو ایوب انصاری مدنی رضؓ۔ ان کا نام خالد بن زید ہے۔ نبی کریمؐ کا تشریف آوریِ مدینہ پر انہی کے یہاں قیام ہوا۔ صحاحِ ستہ میں ان سے ۱۵۰ حدیثیں مروی ہیں، ۷ حدیثیں بخاری و مسلم میں ہیں۔ ایک بخاری میں اور ۵ مسلم میں ہیں۔ ۵۲ ہجری میں غزوۂ رُوم میں انتقال کیا اور قلعۂ قسطنطنیہ کے متصل مدفون ہوئے۔

۱۴۔ حضرت عثمان بن عفان رضؓ ذو النورین اور خلفائے راشدین میں تیسرے خلیفہ۔ صحاحِ ستہ میں ان سے ۱۴۶ احدیثیں مروی ہیں۔ ۳ حدیثیں بخاری و مسلم میں اور ۸ بخاری

میں اور پانچ مسلم میں ہیں۔ ۷ ذی الحجہ ۳۵ھ میں شہید ہوئے۔

۱۵۔ حضرت جابر بن سمرۃؓ۔ نزیل کوفہ۔ ان سے ۱۴۶ حدیثیں مروی ہیں، ۲ بخاری و مسلم میں اور ۲۲ مسلم میں۔ ۷۴ھ میں انتقال کیا۔

۱۶۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ۔ آپ سب سے پہلے اسلام لائے اور تمام صحابہؓ میں افضل ہیں۔ ہجرت میں حضورؐ کے رفیق اور سب سے پہلے خلیفہ ہیں۔ آپ سے ۱۴۲ حدیثیں مروی ہیں۔ ۶ بخاری و مسلم میں، ۱۱ بخاری میں اور ایک مسلم میں ہے۔ آپ کی سوانح تاریخ الشام میں ڈیڑھ جلد میں ہے۔

آپ نے ۱۳ھ میں بعمر ۶۳ سال وفات پائی۔ گنبدِ خضرا میں رسالت مآبؐ کے قرین محوِ خواب ہیں۔

۱۷۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضؓ بن ابی عامر الثقفی زمانۂ خندق میں اسلام لائے۔ بڑے ادیب اور عاقل تھے۔ ان سے ۱۳۶ حدیثیں مروی ہیں، ۹ حدیثیں بخاری و مسلم میں ہیں اور ایک بخاری اور دو مسلم میں ہیں۔ ۵۰ھ میں انتقال فرمایا۔

۱۸۔ حضرت ابوبکرہ رضؓ۔ ان کا نام نفیع بن الحارث ہے اور ثقفی ہیں۔ ان کی ۱۳۲ حدیثیں ہیں، ۸ حدیثیں بخاری و مسلم میں ہیں اور ۵ بخاری میں اور ۵ مسلم میں ہیں۔ ۵۱ھ میں انتقال کیا۔ جنگِ جمل اور صفین سے جدا رہے۔

۱۹۔ حضرت عمران بن حصین رضؓ خزاعی۔ ایامِ خیبر میں اسلام لائے۔ فتنہ سے جُدا رہے۔ ملائکہ ان پر سلام کرتے تھے۔ ان سے ۱۳۰ حدیثیں مروی ہیں۔ ۸ بخاری و مسلم میں ہیں اور چار بخاری میں اور ۹ مسلم میں ہیں۔ ۵۲ھ میں انتقال فرمایا۔

۲۰۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ اموی۔ زمانۂ فتحِ مکہ میں اسلام لائے۔ شام کے

بیس سال والی اور بیس سال بادشاہ رہے۔ ان سے ۱۲۰ احادیث مروی ہیں، ۴ حدیثیں بخاری و مسلم میں اور چار بخاری میں اور ۵ مسلم میں ہیں۔ ۶۰ھ میں انتقال فرمایا۔

۲۱۔ حضرت ثوبان مولی النبی صلعم۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر و حضر ملازم صحبت رہے۔ بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شام میں مقیم رہے۔ ان سے ۱۲۷ حدیثیں مروی ہیں۔ مسلمؒ نے دس حدیثیں روایت کی ہیں۔

۵۴ھ میں بہ مقام حمص انتقال فرمایا۔

۲۲۔ حضرت اسامہ بن زید رضؓ بن حارثہ کلبی۔ حضرت زید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّیٰ کے لڑکے۔ ان سے ۱۲۸ حدیثیں مروی ہیں، ۱۵ حدیثیں بخاری و مسلم میں ہیں اور دو حدیثیں بخاری میں اور ۲ دو مسلم میں ہیں۔ ۵۴ھ میں انتقال فرمایا۔

۲۳۔ حضرت نعمان بن بشیر رضؓ انصاری خزرجی۔ کوفہ اور دمشق کے والی رہے۔ ان سے ۱۱۴ حدیثیں مروی ہیں، ۵ حدیثیں بخاری اور مسلم میں اور ایک بخاری میں اور چار مسلم میں ہیں۔ ۶۴ھ میں انتقال فرمایا۔

۲۴۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ فزاری نزیل بصرہ۔ ان سے ۱۲۳ احادیث مروی ہیں۔ ۲ دو حدیثیں بخاری و مسلم میں۔ اور ۲ دو بخاری میں اور ۴ مسلم میں ہیں۔ بہ مقام بصرہ ۵۹ھ میں انتقال فرمایا۔

۲۵۔ حضرت ابو مسعود رضؓ عقبہ بن عمرو بن ثعلبہ انصاری الخزرجیؓ۔ ان سے ۱۲۲ حدیثیں مروی ہیں، ۹ حدیثیں بخاری و مسلم میں ہیں اور ایک بخاری میں اور ۷ مسلم میں ہیں۔ ۴۰ھ میں انتقال فرمایا۔

۲۶۔ حضرت جریر بن عبداللہ بن جابر۔ ۱۰ھ میں اسلام لائے۔ حضور صؐ نے

ان کے لیے چادر بچھائی۔ اور ذی خلصہ (یمن کا کعبہ) منہدم کرنے کے لیے بھیجا۔
حضور صلعم کے زمانہ میں یمن کے عامل رہے۔ ان سے سو حدیثیں مروی ہیں۔ ۸ بخاری
و مسلم میں۔ ایک بخاری میں اور ۶ مسلم میں ہیں۔ ۵۱ھ میں انتقال فرمایا۔۔۔